# KHALID HUSSAIN BA-HAISIYETH AFSANA NIGAR

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in the partial fulfillment of the requirements for the award of

**MASTER OF PHILOSOPHY**

**IN**

**URDU**

**By**

**QAMAR SAJAD THOWKAR**

**DEPARTMENT OF URDU**

**SCHOOL OF HUMANITIES**

**UNIVERSITY OF HYDERABAD**

**HYDERABAD – 500046**

**TELANGANA, INDIA**

**JUNE 2014**

# *DECLARATION*

I Qamar Sajad Thowkar hereby declare that the dissertation entitled ***"Khalid Hussain Ba-haisiyeth Afsana Nigar"*** submitted by me under the guidance and supervision of ***Dr. Arshia Jabeen*** for the award of Master of Philosophy in Urdu, in the University of Hyderabad, is my own research work. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

**Signature of the Student**

***Mr. Qamar Sajad Thowkar***

**Date_____**

**Reg. No. 13HUHL18**

# *CERTIFICATE*

This is to certify that the dissertation entitled "***Khalid Hussain Ba-haisiyeth Afsana Nigar"*** submitted by ***Qamar Sajad Thowkar*** bearing Reg. No. 13HUHL18 in partial fulfillment of the requirements for the award of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

"Countersigned" Signature of the Supervisor

**Dr. Arshia Jabeen**

Head
Department of Urdu

Dean
School of Humanities

# خالد حسین بحیثیت افسانہ نگار

مقالہ برائے

ایم۔فل (اردو)

2013-2014


نگراں

**ڈاکٹر عرشیہ جبین**

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

مقالہ نگار

**قمر سجاد ٹھوکر**

ایم۔اے (سلیٹ)

شعبہ اردو اسکول آف ہیومانیٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۴۶

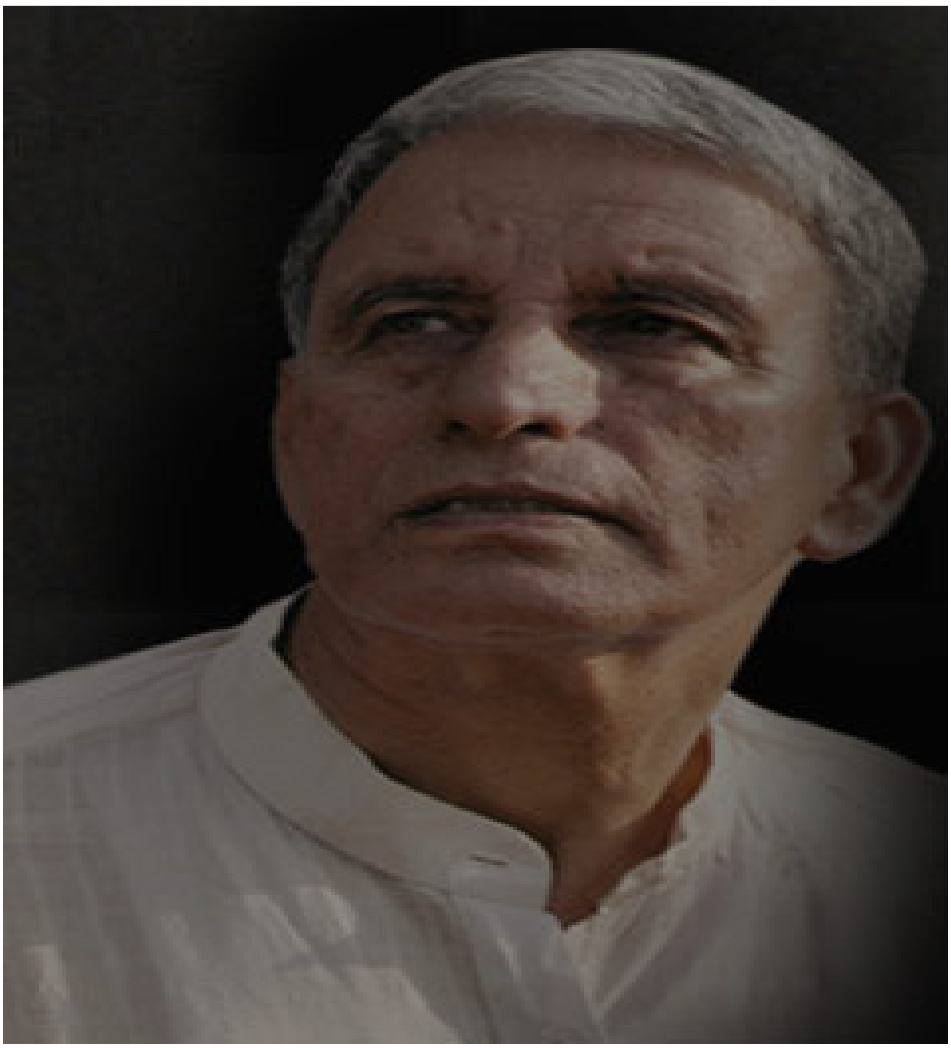

خالد حسین

# فہرست


پیش لفظ ۱

**باب اول:**

خالد حسین کے خاندانی حالات اور ولادت ۵

(الف) خاندانی حالات

(ب) شخصیت

**باب دوم:**

خالد حسین کے معاصر افسانہ نگار ۲۵

**باب سوم:**

خالد حسین کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ ۴۳

**باب چہارم:**

مجموعی جائزہ ۱۰۰

کتابیات ۱۱۸

# پیش لفظ

جموں وکشمیر ایک کثیر اللسانی ریاست ہے۔ یہاں کے ادیب اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔اس طرح جن ادیبوں نے اپنی ایک شناخت اورانفرادیت قائم کی ہے،ان میں خالد حسین کا نام سرفہرست ہے۔ یہ پنجابی کے ادیب ہیں لیکن اردو میں بھی انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے ۔بحیثیت مجموعی اُردو کے افسانوی ادب میں تو اُن کا شمار ہے ہی لیکن اپنے مخصوص طرزِتحریراوردلکش اُسلوبِ بیان کی وجہ سے پنجابی ادب میں ایک معتبراورممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔کچھ لوگ انہیں پنجابی لٹریچر کا منٹو بھی قرار دیتے ہیں۔

خالد حسین نے متعدد نفسیاتی معاملات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے ۔ان کے افسانے عصرِ حاضر کے اقتصادی،سماجی،اورسیاسی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں لیکن ان کے اکثر افسانوں کا موضوع ذات کا کرب ہے۔ان کے بعض افسانوں میں ان دونوں رجحانات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

تحقیق میں موضوع کا انتخاب ایک اہم مرحلہ ہے ۔ایم۔فل میں جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں افسانہ نگاری پر کام کرنا چاہتا تھا۔ مجھے میرے ایک دوست نے خالد حسین کی افسانہ نگاری پر کام کرنے کا مشورہ دیا اس لئے جب میں نے خالد حسین کی افسانہ نگاری پر کام کرنے کے لئے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تو میری نگراں ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ،صدر شعبہ اردو اور دیگر اساتذہ کرام کی منظوری کے بعد میری تحقیق کا موضوع ''خالد حسین بہ حیثیت افسانہ نگار'' طے پایا۔

میں نے اپنے مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول ''خالد حسین کے خاندانی حالات اور ولادت'' سے متعلق ہے ۔اس باب میں خالد حسین کے حالاتِ زندگی اور شخصیت کا اختصار سے جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم ''خالد حسین کے معاصر افسانہ نگار'' کے عنوان کے تحت ہے جس میں جموں وکشمیر کے

چند نمائندہ افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم ''خالد حسین کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان کے تحت ہے۔ یہ مقالہ کا اہم باب ہے۔اس میں ان کے افسانوں کا تفصیل سے تنقیدی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم ''مجموعی جائزہ'' پر مشتمل ہے۔اس باب میں خالد حسین کے افسانوں کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے ناقدین کی آراء کی روشنی میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا بے انتہا ممنون و مشکور ہوں جس نے مجھے تمام مصائب و آلام سے محفوظ رکھ کر اتنی طاقت، ہمت اور حوصلہ عطا کیا کہ میں اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکا۔رب العزت کے بعد میں اپنے مشفق و محبی والدین کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں جن کی اچھی تعلیم و تربیت، حوصلہ افزائی، محنت، لگن اور دعاؤں کی بدولت میں اس مقام پر پہنچ پایا ہوں۔ بالخصوص میری والدہ محترمہ رحتی بیگم جن کی دعاؤں نے اچھے بُرے وقتوں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔اللہ تعالیٰ انہیں دونوں جہانوں میں سرخ روئی عطا فرمائے۔میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کا بھی شکر گذار ہوں جن کی نہ صرف دعائیں میرے ساتھ رہیں بلکہ انہوں نے ہر مشکل مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی اور بھرپور تعاون بھی کیا۔میں ان کے لئے دعا گو رہوں گا۔

میں اپنی نگراں محترمہ ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا ممنون و مشکور ہوں جنہوں ں نے بہ حیثیت نگراں میری بھرپور رہنمائی اور مدد فرمائی۔دورانِ تحقیق اُن کی شفقت و محبت حاصل رہی جسے میں بیش بہا اثاثہ سمجھتا ہوں۔انہوں نے مجھے تحقیق کے ہر مرحلہ میں بھرپور وقت دیا، تعاون کیا اور رہنمائی کی، میں ان کے لئے دعا گو ہوں۔

میں شعبہ اردو کے دیگر اساتذہ کرام جناب پروفیسر مظفر علی شہ میری صاحب، پروفیسر محمد انوار الدین صاحب، پروفیسر محمد بیگ احساس صاحب، پروفیسر رضوانہ معین صاحبہ، ڈاکٹر حبیب نثار صاحب ، ڈاکٹر عبدالرب منظر صاحب ،ڈاکٹر زاہد الحق صاحب ،ڈاکٹر محمد کاشف صاحب اور ڈاکٹر نشاط صاحب کا بھی

سپاس گذار ہوں جنہوں نے تحقیق کے دوران مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں محترم خالد حسین صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں۔ خالد حسین ایک مشفق و مہربان شخصیت کا نام ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب پہلی مرتبہ مجھے ان سے ملنے اور ملاقات کرنے کا موقعہ فراہم ہوا۔ جب کبھی بھی مجھے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں ان کے یہاں جانا پڑا تو انہوں نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود نہ صرف مکمل تعاون کیا بلکہ بڑے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنا غیر مطبوعہ مواد بھی فراہم کر کے میری بھرپور مدد کی۔ میں ان کے حق میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت یاب رکھے اور اسی طرح وہ ادب کی خدمت میں کوشاں رہیں۔

آخر میں اپنے دوست ''عدنان حبیب'' کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے قلیل مدت میں بڑی خوش اسلوبی سے میرے اس مقالے کی کمپوزنگ کی۔

قمر سجاد ٹھوکر
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو
یونی ورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد
جون 2014ء

# باب اول

# خالد حسین کے خاندانی حالات اور ولادت

## خاندانی حالات اور ولادت

خالد حسین کی ولادت یکم اپریل 1945ء کو جموں کے ضلع اودھم پور میں ہوئی۔ان کے والد کا نام غلام حسین تھا اور وہ اپنے زمانے کے بہترین استاد تصور کئے جاتے تھے۔خالد حسین صرف دو برس کے تھے کہ ملک تقسیم ہوا۔تقسیم کے ساتھ ہی ہجرت اور بے گھری کے مسائل پیدا ہوئے۔خون ریزی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔پورے ملک کی طرح ہماری ریاست میں بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ہزاروں لوگ مارے گئے اور نتیجے میں خالد حسین کے والد بھی مارے گئے۔ساتھ ہی ساتھ خالد حسین کے دادا اور دو چچا (ماسٹر عبدالکریم اور عبدالقیوم) بھی فسادات کی ہولناک واردات میں مارے گئے۔

### دادا:

حبیب اللہ خالد حسین کے دادا کا نام ہے۔وہ پیشہ سے درزی تھے۔ان کے چار اولادیں تھیں جن میں تین بیٹے غلام حسین،عبدالکریم ،عبدالقیوم اور ایک بیٹی غلام فاطمہ تھیں۔غلام فاطمہ پیشہ سے ٹیچر تھیں۔1947ء کے خون خرابے میں جب خالد حسین کے والد اور ان کے چچا مارے گئے تو ان کے باقی اہلِ خانہ اودھم پور میں اپنے گھر بار کو چھوڑ کر جموں چلے آئے۔یہاں ایک رفیوجی کیمپ قائم کیا گیا جس میں کئی دور دراز علاقوں سے بھاگے ہوئے مسلم لوگ اپنی جان بچا کر رہائش پذیر ہوئے۔اس رفیوجی کیمپ کی کمانڈنٹ خالد حسین کی پھوپھی غلام فاطمہ بنائی گئیں۔جب رفتہ رفتہ حالات بحال ہوئے تو وہ دوبارہ ٹیچر مقرر کی گئیں۔بلاشبہ 1947ء کے فسادات تقسیمِ وطن کے المیہ نے خالد حسین پر کافی گہرا اثر چھوڑا جس کا بیان انہوں نے اپنی تخلیق ''اشتہاروں والی حویلی'' میں کچھ یوں کیا ہے:

> ''میں یکم اپریل 1945ء کو اودھم پور میں پیدا ہوا۔ابھی ماں کے دودھ کی بتیس دھاریں بھی پوری طرح نہیں پی تھیں کہ سیاست دانوں کی کرامات رنگ لائیں۔ملک تقسیم ہوا۔ایک طوفان اٹھا اور انسان کا لہو پانی ہوگیا۔انسانیت

مرگئی۔سیاست دانوں نے اپنے نجی مقاصد کی تکمیل کے لئے مذہبی جنون کوخوب
اُبھارا۔ہرطرف آگ اورخون کی ہولی کھیلی گئی اوراس میں اودھم پور کے ایک
انسان ماسٹر غلام حسین ،چچاماسٹر عبدالکریم اورعبدالقیوم سب نفرت کی آندھی
میں فنا ہوگئے ،ہنستابستا گھر اُجڑ گیا ۔سب کچھ ختم ہوگیا۔لیکن زندگی کے
دشوارگذارراستوں پر بھٹکنے کے لئے زندہ رہ گیا۔خالد حسین‘‘1؎

**والدہ:۔**

خالد حسین کی والدہ محترمہ کا نام بتول بیگم تھا جو بڑی رحمدل اور نیک سیرت خاتون تھیں ۔انہوں نے خالد حسین کی پرورش میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ۔انہوں نے بہت مصیبتوں کی حالت میں ان کی پرورش کی ۔والد کے انتقال کے بعد گھر کی تمام ذمہ داریاں ان پرآن پڑی۔جنہیں بڑی ہمت اور حوصلہ کے ساتھ ان کی والدہ محترمہ نے خوب انجام دیں۔

**تعلیم وتربیت:**

خالد حسین کی عمر صرف دوسال کی تھی جب ان کے والد 1947ء کے فسادات میں مارے گئے ۔والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش کی ساری ذمہ داری ماں کے کندھوں پرآئی جنہوں نے اس ذمہ داری کو بڑی خوبی سے نبھایا اوران کی تعلیم وتربیت میں بھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ۔خالد حسین کی ابتدائی تعلیم دو پرائمری اسکولوں میں ہوئی ۔پرائمری اسکول بٹہ مالو(سرینگر)اور پرائمری اسکول استادمحلّہ۔اس کے بعد آٹھویں جماعت تک کی تعلیم سنٹرل اسکول پرانی منڈی جموں سے حاصل کی ۔اس کے بعد کرسچن میموریل اسکول اورایس ۔پی اسکول سرینگر سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔میٹرک کا متحان پاس کرنے کے بعد ہی خالد حسین کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوئے ۔ملازمت کے فوراًبعد ہی ان کی شادی ہوئی ۔اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی ۔شادی کے چوتھے سال جب خالد حسین کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو اس وقت انہیں دوبارہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔بعد میں انہوں نے کشمیر یونیورسٹی سے ادیب کی ڈگری حاصل

کی ۔اس کے بعد جموں میں اورینٹل کالج (Exchange Road) میں داخلہ لیا اور بی۔اے کی ڈگری لی ۔اس کے بعد جرنلزم میں بھی ڈپلومہ حاصل کیا۔

**ملازمت:۔**

خالد حسین میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے کے فوراً بعد ہی محکمہ دیہات سُدھار (Rural Development) میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوئے ۔اس وقت آپ صرف سولہ سال کے تھے۔آپ نے اپنی ابتدائی ملازمت کے فرائض بڑی دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیں۔اس کے بعد آپ چار سال تک (یعنی 1975ء تا 1978ء) مرزا فضل بیگ، جو اس وقت جموں وکشمیر کے ڈپٹی چیف منسٹر (Deputy Chief Minister) تھے، کے پی۔اے (Personal Assitant) رہے۔اس ملازمت کے دوران ہی آپ کی ترقی ہوئی اور آپ (Gazetted Cadre) کے زمرے میں آئے۔ بیگ صاحب کی سبکدوشی کے بعد خالد حسین ماہنامہ دیہات سُدھار کے مدیر (Editor) بنائے گئے۔ یہاں ان کی ملاقات محترمہ تنویر جہاں اور نور شاہ صاحب سے ہوئی۔

نور شاہ اور تنویر جہاں کی بدولت خالد حسین کی زندگی میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب ان دونوں کی جدوجہد اور کوششوں کی وجہ سے انہیں بی۔ڈی۔اُو (Block Development Officer) بنایا گیا۔اس طرح خالد حسین سکریٹریٹ کو چھوڑ کر بطور Field officer کام کرنے لگے۔جب 1984ء کے ریاستی اسمبلی کے الیکشن میں نیشنل کانفرس دوڈھائی اکثریت سے کامیاب ہوئی تو یہ کامیابی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔کیوں کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور وزیرِ ہند محترمہ اندرا گاندھی کے مابین سیاسی رسا کشی نے ایسی شکل اختیار کر لی کہ سارے قومی اخبارات خاص کر شمالی ہندوستان بشمول جالندھر اور چندی گڑھ کے اخبارات فاروق عبداللہ کے خلاف ایک زوردار مہم چلا رہے تھے اور انہیں وطن کا غدار اور پاکستان کا ایجنٹ ثابت کرنے میں کوشاں تھے ۔اس کام کے لئے ان اخبارات کو خفیہ ایجنسیوں کی جانب سے بھاری رقومات دی جاتی

تھیں۔محمد شفیع اوڑی ان دنوں ممبر اسمبلی اور وزیر اطلاعات تھے۔وہ خالد حسین کو ادیب کی حیثیت سے جانتے تھے اور اس بات سے بھی بخوبی واقف تھے کہ خالد حسین پنجاب کے تمام اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اخباری حلقون میں خالد حسین کی جان پہچان اور دوستی ہے۔لہذا انہوں نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یہ تجویز دی کہ خالد حسین کو محکمہ دیہات سُدھار (Department of Reral develoment) سے ہٹا کر محکمہ اطلاعات (Information Department) میں تعینات کیا جائے اور (Press Bureau of Information) جالندھر میں بحثیت پبلک ریلیشن آفیسر (Public Relation Officer) رکھا جائے تا کہ وہ ریاست جموں وکشمیر کے سیاسی واقتصادی حالات کے بارے میں قومی پریس تک صحیح آگاہی پہنچا سکیں۔لہذا ان کے کہنے پر خالد حسین کو پنجاب بھیجا گیا جہاں انہوں نے ریاستی حکومت کی پالیسیوں سے متعلق کئی آرٹیکل (Article) لکھے اور اخباروں کے مالکان اور مدیروں سے مل کر انہیں حقیقی سیاسی حالات سے متعلق آگاہ کیا۔اسی دوران پنجاب میں بلیو اسٹار آپریشن (Blue Star Operatio) ہوا۔مرکزی حکومت کی سازش سے جموں وکشمیر میں فاروق عبداللہ کی حکومت گرادی گئی اور چودہ اسمبلی ممبروں کو نیشنل کانفرس سے توڑ کر کانگریس کی حمایت سے ایک نئی حکومت بنائی گئی جس کی سربراہی غلام محمد شاہ المعروف گل شاہ کو سونپی گئی اور بعد میں وہ وزیر اعظم بھی بن گئے۔

غلام محمد شاہ کی حکومت میں جو پہلا آرڈر ہوا، ان میں خالد حسین کو جالندھر کے اطلاعاتی دفتر سے ہٹا کر (General Department) میں تعینات کیا گیا۔اس کے بعد ان ہی کی فرمائش پر انہیں پھر محکمہ دیہات سُدھار میں تعینات کیا گیا۔بعد ازاں خالد حسین ڈُوڈُو بسنت گڑھ کے (Area Development Officer) تعینات کئے گئے۔ابھی دو ہی مہینے ہوئے تھے کہ انہیں وہاں سے ہٹا کر DRDA, Project officer پونچھ بھیج دیا گیا۔وہاں ابھی بیس ہی دن گذرے تھے کہ خالد حسین دوبارہ ڈوڈو تعینات کیا گیا جہاں وہ 1987ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔بعد میں وہ ڈوڈہ کے ACD، (Assistant Commissioner Dvelopment) منتخب کئے گئے۔

1990ء میں خالد حسین کا تبادلہ ڈوڈہ سے ضلع پونچھ میں ACD کی حیثیت سے ہی ہوا۔ پی۔ دھر۔ چکرورتی صاحب اس وقت پونچھ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ مسٹر چکرورتی کا تعلق بنگال کے ایک مشہور و معروف سنگیت کار خاندان سے تھا وہ فنون لطیفہ سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ لہذا ان دونوں کی کوششوں کی وجہ سے پونچھ میں بہت سارے دلچسپ پروگرام منعقد کئے گئے۔ بعدازاں خالد حسین 1993ء میں راجوری میں اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔

1998-99ء میں خالد حسین کا تقرر دوبارہ پونچھ میں بحیثیت ڈپٹی کمشنر (D.C) ہوا۔ وہاں انہوں نے اپنی ذمہ داری کو بڑی دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیں۔ 2001ء میں آپ شرِ کشمیر زرعی یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد نومبر 2002ء میں آپ ڈائریکٹر ایمپلائمنٹ (Director Employment) مقرر ہوئے۔ 2003ء میں آپ Managing Director تعینات ہوئے اور اس کے بعد محکمہ خوراک (Food & Supplies) کے اسپیشل سکریٹری ہوئے اور اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ بعدازاں ریاستی سرکار نے انہیں پانچ برس کے لئے 2003-08ء جموں و کشمیر اسٹیٹ کنزیومر پروٹیکشن (State Consumer Protection) کا ممبر منتخب کیا۔ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ کئی ادبی انجمنوں اور اداروں سے بھی وابستہ رہے جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

خالد حسین 1975-76 میں ریاست کے ''پنجابی ساہتیہ سبھا'' کے صدر رہے۔ اس کے بعد آپ کو دوبارہ 1981ء میں مذکورہ عہدے پر فائز کیا گیا۔ علاوہ ازیں آپ 1982-83ء میں مرکزی پنجابی ''لکھاری سبھا جالندھر'' کے نائب صدر رہے۔ 2001ء میں ''انجمن فروغ اردو'' کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اپریل 2008ء سے ستمبر 2010ء تک انٹرنیشنل ٹیلی کام کمپنی Vodafone کے "Corporate Affairs" کے مشیر اور سربراہ رہے۔ پانچ سال تک 2002-07ء ''ساہتیہ اکیدمی، نئی دہلی'' کے ایڈوائزوری بورڈ (Advisory Board) پنجابی کے لئے ممبر رہے۔ 2008-09ء میں ساہتیہ

اکیڈمی لدھیانہ کے نائب صدر رہے۔2011ء سے تاحال آپ سول سوسائٹی برائے ادب وفن جموں کے جنرل سکریٹری ہیں۔ (General Secratary,Civil Society for Art and Literature ,Jammu) اورساتھ ہی ساتھ آپ 2011ء سے تاحال ہندو پاک پیس کونسل جموں وکشمیر چپٹر کے نائب صدر ہیں۔ (Vice-President of Pak-India People's Forum for Peace ,Peace Activist)

**شادی:۔**

خالد حسین کی شادی 12 رجنوری 1964ء کو ہوئی۔اس وقت آپ 18 سال 9 ماہ اور 12 دن کے تھے۔آپ کی رفیق حیات کا نام نسیم فردوس ہے۔وہ خوبصورت اور خوب سیرت ہیں۔خالد حسین کے خسر کا نام سعید اللہ ملک اور ساس کا نام وزیر بیگم ہے۔وزیر بیگم بے حد نیک سیرت خاتون ہیں اور سیاست سے وابستہ رہی ہیں۔اُن کی وابستگی برسر اقتدار پارٹی نیشنل کانگریس سے ہے۔وہ دومرتبہ مذکورہ پارٹی سے ایم۔ایل۔سی رہ چکی ہیں۔خالد حسین کے سسرال والوں کا تعلق کشمیر کے شوپیاں علاقہ سے ہے۔یہ لوگ وہاں سے ہجرت کر کے تحصیل رام نگر کے موضع لاٹی دھونہ (بلاک ڈوڈہ بسنت گڑھ) میں آکر آباد ہو گئے اور تاحال یہیں مقیم ہیں۔

**اولاد:**

خالد حسین کی اہلیہ نسیم فردوس ایک سلیقہ شعار گھریلو خاتون ہیں۔انہوں نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔خالد حسین اور نسیم فردوس کی چار اولادیں ہیں جن میں دو بیٹیاں سمیہ تبسم اور ہُما تبسم اور دو بیٹے ذاکر حسین اور یاسر عمران شامل ہیں۔بڑی بیٹی سمیہ تبسم ہیں۔وہ بحیثیت لکچرار کام کر رہی ہیں۔انہوں نے جموں یونیورسٹی سے ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی حاصل کی ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ان کا بیاہ بھدرواہ کے ایک انجینئر محمد ایوب وانی سے ہوا ہے۔سمیہ تبسم کے دو بیٹے ہیں۔گوہر ایوب اور احمر ایوب۔دونوں انجینئرنگ کر رہے ہیں۔دوسری بیٹی ہُما تبسم پیشہ سے ڈاکٹر ہیں۔ان

کے شوہر عشرت چودھری بھی ڈاکٹر ہیں۔ اِن کے بھی دو بیٹے ہیں۔ آریب اور ارحم چودھری۔ آریب آٹھویں جماعت میں اور ارحم چھٹی جماعت میں پڑھ رہے ہیں۔

ذاکر حسین، خالد حسین کے بڑے بیٹے ہیں۔ وہ پیشہ سے بزنس مین ہیں۔ ان کی بیوی کا نام فرحت بانو ہیں اور وہ ایک گھریلو عورت ہیں ان کی دو بیٹیاں زارہ فردوس اور رمشا ہیں۔ زارہ فردوس بارہویں جماعت میں اور رمشا آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی ہیں۔ خالد حسین کے چھوٹے بیٹے یاسر عمران بھی پیشہ سے بزنس مین ہیں۔ ان کی بیوی کا نام ثنا فاروق ہے۔ انہوں نے ایم۔ اے انگلش تک کی تعلیم پائی ہے۔ اِن کا صرف ایک بیٹا یشب خالد کے نام سے ہے اور وہ یو۔ کے۔ جی (UKG) میں پڑھ رہا ہے۔

## ادبی سفر اور ادبی خدمات:

خالد حسین کو بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ انہیں اردو شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ اسی لئے انہوں نے کئی شعراء کا مطالعہ بھی کیا تھا ان کے پسندیدہ شعراء میں میر، غالب، فیض، احمد فراز، قتیل شفائی وغیرہ شامل ہیں۔ ان سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ لیکن شاعری کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ نثر میں افسانہ ان کی پسندیدہ صنف تھی جس میں وہ اپنے تجربات و مشاہدات اور احساسات کا اظہار کا بہترین وسیلہ تصور کرتے تھے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کی طرف توجہ کرنے کی وجوہات بتاتے ہوئے ایک جگہ خود لکھا ہے:

> ''1947ء کے المناک ہنگاموں کی وجہ سے 7 برس تک ہم رفیوجی کیمپوں میں بھٹکتے رہے۔ ماں نے بہت مصیبتوں کی حالت میں پرورش کی۔ پڑھایا، لکھایا اور روزگار کے قابل بنادیا۔ لیکن بچپن میں یتیمی کی جو مار میں نے سہی ہے اس نے مجھے بے حد جذباتی بنادیا۔ مایوسی اور محرومی کے احساس میں پلنے بڑھنے والا خالد حسین اپنے لاشعور میں زندگی کی تلخیوں کو پالتا پوستا رہا۔ سماج کے ناسور چنتا رہا، اردگرد کے المیے دیکھتا رہا اور ان المیوں سے جو کچھ اخذ کیا، وہ کہانیوں کی صورت میں سامنے لانے کی کوشش کرتا رہا ہوں''[2]

اس طرح افسانہ نگاری کی طرف توجہ کر کے کئی ایک افسانے لکھے اور منفرد مقام حاصل کیا۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کی شروعات پنجابی زبان سے کی ۔تا حال ان کی پنجابی کہانیوں کے جو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں ان کے نام یوں ہیں ''جہلم وگدار یہا1976ء''، ''گوری فصل دے سوداگر'' 1981ء، ''ڈونگے پانیاں دادکھ'' 1991ء، اور ''بلدی برف داسیک'' 2005ء۔خالد حسین اگر چہ بنیادی طور پر پنجابی کے افسانہ نگار ہیں لیکن اردو زبان وتہذیب کے دلدادہ ہونے کے سبب ایک اچھے کہانی کار کی حیثیت سے اُردو کے ادبی حلقوں میں بھی اپنی ایک منفرشناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔اُردو زبان میں بھی انہوں نے یکساں مقبولیت اور شہرت پائی۔اُردو زبان میں ان کے ادبی سفر کا آغاز 1969ء میں جموں کے ایک سرکاری اخبار ''دیہات سُدھار'' سے ہوئی۔جس میں ان کی پہلی کہانی بعنوان ''گھر کی جنت'' شائع ہوئی۔اس کہانی کی پذیرائی نے خالد حسین کے نہ صرف حوصلے بلند کیے بلکہ انہیں نہایت سنجیدگی سے خوب سے خوب تر کہانیاں لکھنے کی طرف مائل بھی کیا۔یہ کہانی خالد حسین کے افسانوی مجموعہ ''ستی سرکا سورج'' میں درج ہے۔اس کے بعد انہوں نے 1970ء میں دوسری کہانی ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے لکھی۔یہ کہانی سرینگر کے ایک جریدہ میں چھپی۔اس کہانی کی وجہ سے خالد حسین کو نوکری سے معطل بھی کیا گیا اور ان پر فحاشی کا الزام لگایا گیا اور مقدمہ بھی چلا۔آخر کار خواجہ احمد عباس ،عصمت چغتائی ،اختر محی الدین ،بلراج ساہنی ،محمد یوسف ٹینگ ،علی محمد لون اور کئی لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ واقعی ایک افسانہ ہے اور اس میں ادیب سماج میں ہو رہے مسائل کی تصویر کشی کرتا ہے۔ان لوگوں کی تحریری تجاویز کی بنا پر تقریباً نو مہینے بعد خالد حسین دوبارہ بحال کیے گئے۔

خالد حسین نے 1975ء میں اپنے دوستوں ہربھجن سنگھ ساگر اور تاراسنگھ چندن کے تعاون سے سرینگر میں ایک کل ہند پنجابی کانفرس منعقد کروائی جس میں ہندوستان بھر سے قریباً تین سو اسکالرز نے حصہ لیا۔دہلی ، یوپی کے علاوہ پنجاب کی تمام یونیورسٹیوں کے پنجابی پروفیسروں اور طلبہ بھی اس کانفرس میں شریک ہوئے ۔یہ دوروزہ کل ہند کانفرس 8-7 جولائی 1975ء کو ٹیگور ہال سرینگر میں منعقد ہوئی اور اس کی صدارت

گیانی ذیل سنگھ نے کی جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلی تھے۔جب کہ ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلی جناب شیخ محمد عبداللہ مہمان خصوصی تھے۔جموں یونیورسٹی میں شعبہ پنجابی کا کھلنا اسی کانفرس کا نتیجہ تھا۔1981ء میں خالد حسین کا پہلا اُردو افسانوی مجموعہ ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' شائع ہوا جس کی ادبی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی۔اس مجموعہ میں جملہ 33 کہانیاں شامل ہیں۔اس مجموعہ میں ایک کہانی ''گھر کی جنت'' کو چھوڑ کر تقریباً 1981ء سے پہلے کی کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔جن میں زیادہ تر پنجابی تخلیقات کا اردو ترجمہ ہیں۔خالد حسین نے اس مجموعہ میں 14 کہانیاں اپنے پنجابی مجموعہ ''جہلم وگدا ریہا'' سے لی ہیں اور باقی 19 تقریباً نئی تخلیقات ہیں۔

اس کے بعد جب خالد حسین کا تقرر 1985ء میں ڈوڈہ میں ہوا تو وہاں انہوں نے کئی ادبی سرگرمیاں شروع کیں۔جن میں تین کل ہند مشاعرے بھی شامل ہیں۔ان مشاعروں میں مظہر امام، سردار پونچھی، پروین کمار اشک، ساحر سیالکوٹی، خالد کفایت اور بشیر بدر جیسے کئی معروف شعراء نے شرکت کی۔ڈوڈہ میں رہتے ہوئے خالد حسین نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر، جن میں ولی محمد اسیر کشتواڑی، اسحاق زرگر، مشتاق فریدی، طالب حسین رند شامل ہیں۔ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کی ہفتے میں دو نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ان نشستوں کی سرپرستی ضلع کے ناظم اعلی اقبال کھانڈے کرتے تھے۔1990ء میں جب خالد حسین کی تبدیلی ڈوڈہ سے ضلع پونچھ میں ہوئی تو وہاں بھی انہوں نے کئی ادبی وسماجی سرگرمیوں کا اہتمام کیا۔وہاں خالد حسین کی ملاقات پی۔دھر چکرورتی سے ہوئی جو اس وقت ضلع پونچھ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔چکرورتی بنگال کے ایک مشہور سنگیت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔اس لیے فنون لطیفہ سے وہ بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ان کے علاوہ یہاں سُدھیر بلوریا (وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی) اور کے۔ڈی۔مینی جو پونچھ میں مقیم تھے، کے تعاون سے خالد حسین نے کئی ادبی وسماجی پروگرام منعقد کرائے جن میں پونچھ میلہ کا اہتمام بھی شامل ہے۔کئی مشاعرے بھی منعقد کئے گئے جن میں ریاست اور ملک بھر کے نامور شعراء اور ادیبوں کو دعوت کے طور پر بلایا گیا۔

1991ء میں ''اشتہاروں والی حویلی'' کے عنوان سے خالد حسین کا دوسرا افسانوی مجموعہ منظر عام پر

آیا۔اس مجموعے میں کچھ مختصر اور کچھ طویل کل اکتیس (31) کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کتاب امروز کتب، عصمت منزل مالیر کوٹلہ پنجاب نے شائع کی ۔اس کتاب کی ترتیب وتزئین کاری خالد کفایت کے ہاتھوں انجام پائی ہے ۔خالد کفایت ،ڈاکٹر زینت اللہ جاوید اور محمد اسد اللہ وانی نے خالد حسین کی کہانیوں پر مختلف موضوعات کے تحت اپنے اپنے خیالات کو قلم بند کیا ہے ۔خالد کفایت نے خالد حسین کو ''چوتھی سمت کا شہزادہ'' قرار دیا ہے۔ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے ''خالد حسین کا تخلیقی رویہ'' اور محمد اسد اللہ وانی نے ''خالد حسین کی افسانہ نگاری'' کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔''اشتہاروں والی حویلی'' میں شامل کہانیوں کے عنوانات پر دھیان دیجئے تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ یہ عنوانات دلچسپ اور دعوتِ مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ 31 کہانیوں کے عنوانات یا نام یوں ہیں:۔''کنوار گندل''،''بیڑے کی لنکا''،''کھوکھلا سورج''،''دیواروں میں چھپی واسنا''،''پانی کی لکیریں''،''مجاہد''،''سیاست''،''سورج کا گیت''،''ابابیل کا خواب''،''علی بابا چالیس چور''،''اندھیر نگری''،''قیامت''،''انتظار کا قیدی''،''صلیب ذات''،''بھوشیہ وانی''،''نئے آدم کا خواب''،''کار جہاں دراز ہے''،روحین''،''دشمنی''،''گھاس پر چلنا منع ہے''،''بابا ٹکی''،''اپنا دامن اپنی آگ''،''پتھریلے پانی میں بہتی ناؤ''،''آوارہ سانپ کا ڈنک''،''دشمن کون''،''دل کی گلیاں''،''گوری فصل کے سوداگر''،''گہرے پانیوں کا دکھ''،کوئلہ بھئی نہ راکھ''،''میری چادر میرے پیر'' اور اشتہاروں والی حویلی۔ یہ تمام کہانیاں خالد حسین کے سماجی وفنی شعور کی غماز ہیں۔

کنوار گندل، بیڑے کی لنکا، کھوکھلا سورج، گھاس پر چلنا منع ہے، اپنا دامن اپنی آگ، گوری فصل سے سوداگر، میری چادر میرے پیر، اور اشتہاروں والی حویلی اس مجموعے کی عمدہ کہانیاں ہیں جن کو ادبی حلقوں میں بے حد مقبولیت وشہرت حاصل ہوئی۔ خالد حسین کے افسانوں کے تعلق سے ڈاکٹر اسد اللہ وانی اپنے تاثرات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''خالد حسین کے افسانوں میں نہ صرف حسن وجمال اور حقیقت ورومان کا امتزاج پایا جاتا ہے یا سماج میں پنپتے ناسور کی عکاسی ہے بلکہ کئی دوسرے مسائل کی نفسیاتی

موشگافی، حق گوئی اور بے باکی سے بات کہنے کی جرأت، مصلحانہ طنز شگفتہ فقرے
بازی، محاوروں کا برمحل استعمال اور کہیں کہیں ابہام بھی پایا جاتا ہے۔اور علامتی
واستعاراتی انداز بھی''۔3

خالد حسین نے خود اس مجموعے میں ''میں اور میری تخلیق'' کے عنوان سے اپنے حالات وواقعات اور کئی حقیقتوں کو قلم بند کیا ہے جو ان کی شخصیت اور ذات کو پرکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔اس تخلیق کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ خالد حسین نے بہت سی ایسی باتیں جو عام ادیب بتانے سے گریز کرتے ہیں، صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔جیسے اپنی اہلیہ کے بارے یوں رقم طراز ہیں:

''میری بیوی صورت کی اچھی ہے، سیرت کی خوب ہے لیکن ایک ادیب کے
ناطے میں اس کے دماغ کی خوب صورتی کی تعریف نہیں کرسکتا، اگر یہ جملہ اُسے
ناگوار گذرے تو وہ مجھے معاف کردے''۔4

1993ء میں جب خالد حسین کی منتقلی راجوری میں ہوئی تو وہاں بھی انہوں نے ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کروایا۔اس کے بعد 98-1999ء میں جب ان کا تقرر دوبارہ پونچھ میں ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے ہوا تو وہاں بھی سرکاری ذمہ داریاں انجام دینے کے ساتھ ساتھ چند نوجوان دوستوں کی حمایت سے ''ایک شام بشیر بدر کے نام'' سے جیسی محفل منعقد کروائی جہاں شعروسخن اور موسیقی کے شائقین خوب لطف اندوز ہوئے۔اس محفل میں مشہور ومعروف شاعر بشیر بدر نے سامعین کو دوگھنٹوں سے زیادہ محظوظ کیا۔اس مشاعرے میں تقریباً دو ہزار لوگوں نے شرکت کی۔اسی طرح پونچھ میں بھی موصوف نے دو کل ہند مشاعرے منعقد کروائے۔اور ''ایک شام ندا فاضلی کے نام'' کے عنوان سے محفل کا انعقاد کروایا جس میں خود ندا فاضلی نے پونچھ کے لوگوں کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔اس کے علاوہ خالد حسین نے پونچھ میں قوالی کا ایک پروگرام منعقد کروایا جس میں قوالن چنچل بھارتی نے ایک عجیب سماں باندھا۔اس کے علاوہ پہلی دفعہ پورن چند وڈالی اور پیارے لال ڈالی کا صوفیانہ کلام بھی پونچھ واسیوں کی نذر کیا گیا جس میں بہت سے مقامی فن کاروں کو باہر کے فن کاروں سے

متعارف ہونے کا موقعہ ملا۔

خالد حسین نے دسمبر 2011ء میں اپنے ساتھیوں کی حمایت سے جن میں آنند ہر، محمد اسلم قریشی لیاقت جعفری، مسعود چودھری، سہیل کاظمی، ڈاکٹر للت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جشنِ فیض'' کے عنوان سے ایک بلند پایہ پروگرام کا انعقاد کروایا۔ ''جشنِ فیض'' میں پاکستان سے آئی ہوئی فیض احمد فیض کی دختر محترمہ سلیمہ ہاشمی نے بھی شرکت کی تھی۔ ان کے علاوہ اس مشاعرے میں پاکستان سے انور مسعور، ایوب خاور، کشور ناہید، علی اکبر ناطق، اعزاز احمد آزر، منظر نقوی اور ہندوستان سے وسیم بریلوی، ندا فاضلی، اشوک، فیاض فاروق، انور جلال پوری، سردار پونچھی، خوشبیر سنگھ شادو غیرہ نے حصہ لیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ 1947ء کے بعد جموں میں اتنا بڑا اور بلند پایہ ادبی پروگرام منعقد کروایا گیا۔

خالد حسین کی کہانیوں کا تازہ اور آخری مجموعہ ''ستی سرکا سورج'' 2011ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ دوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں خالد حسین کی کل بیس کہانیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ آخری صفحات پر ''ہاتھی اڑھائی لاکھ کا'' (انشائیہ) اور ''عشق نچائے تھیا تھیا'' (فکاہیہ) بھی شامل ہے۔ یہ مجموعہ ادبی محفلوں اور ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس مجموعے میں خالد حسین کی وہ پہلی کہانی بھی شامل ہے جو انہوں نے 1969ء میں ''گھر کی جنت'' کے عنوان سے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس مجموعہ میں خالد حسین کا شاہکار افسانہ ''ستی سرکا رسورج'' بھی شامل ہے جس کے عنوان پر اس مجموعے کا نام رکھا گیا۔

## تصانیف:

خالد حسین پنجابی اور اُردو، دونوں زبانوں پر یکساں اور غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ تاحال ان کی پنجابی اور اُردو کی جو تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ان کے نام درج ذیل ہیں:

### ا۔ اردو تصانیف

1۔ ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں 1981ء

2۔ اشتہاروں والی حویلی 1991ء

3۔ستی سر کا سورج 2011ء

## II۔پنجابی تصانیف

1۔جہلم وگدار یہا 1976ء

2۔گوری فصل دے سوداگر 1982ء

3۔ڈونگے پانیاں دا دکھ 1993ء

4۔بلدی برف دا سیک 2005ء

5۔گواچی جھامجھ دی چیک 2010ء

6۔نوری ریشماں 2009ء

7۔خالد حسین دا کتھا ساگر 2010ء

## انعامات واعزازات:

خالد حسین کو اُردو اور پنجابی ادب کی خدمات کے اعتراف میں کئی انعامات واعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے۔لیکن ان کی شہرت ومقبولیت زیادہ تر ان کی پنجابی کہانیوں کی وجہ سے ہے۔انہوں نے پنجابی زبان میں بہت سی شاہکار کہانیاں لکھیں جن پر انہیں وقتاً فوقتاً انعامات واعزازات سے بھی نوازا جاتا رہا ہے جن کی فہرست اس طرح ہے

1۔خالد حسین کو ریاستی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے 1977ء میں ''جہلم وگدار یہا'' پر پہلا انعام ملا۔

2۔پنجابی زبان کی خدمات کے لئے خالد حسین کو 1982ء میں پنجاب گورنمنٹ نے خلعت فاخرہ سے نوازا، یہ انعام انہیں اس وقت کے پنجاب کے گورنر کے ہاتھوں ملا۔

3۔1983ء میں ''گوری فصل دے سوداگر'' پر انہیں ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے انعام ملا۔

4۔خالد حسین کو ''پنجاب رتن'' کے انعام سے بھی سرفراز کیا گیا اور یہ انعام انہیں اس وقت کے پنجاب کے ایجوکیشن منسٹر کے ہاتھوں ملا۔

5۔خالد حسین کو پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ کی جانب سے ''خلعتِ فاخرہ'' انعام سے بھی نوازا گیا، یہ انعام انہیں 30اپریل2012ء کو پنجاب کے وزیراعلیٰ پرکاش سنگھ بادل کے ہاتھوں دیا گیا۔

# شخصیت

خالد حسین کی شخصیت جامع الصفات ہیں ۔وہ ایک کامیاب وکامراں افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف تو ہیں ہی لیکن ان کی شخصیت کو اُبھارنے میں ان کے عادات واطوار وکردار کا بھی اہم رول رہا ہے۔نور شاہ خالد حسین کی شخصیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''خالد حسین کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے کے فن سے بخوبی واقف ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُس کے دوست واحباب کی تعداد بہت زیادہ ہے۔وہ ایک خوبصورت شخصیت کا مالک ہے اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ پھولوں جیسی نرم ونازک مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے۔باتیں کرنے کے انداز میں بھی اُس کی شرافت اور شائستگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔میں جب بھی اُس کی پوری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں،تو وہ مجھے آج بھی دوستوں کی محفل میں بے تاج بادشاہ کے روپ میں نظر آتا ہے''5؎

**حلیہ:**

خالد حسین کا حلیہ کچھ اس طرح ہے: وہ ظریف اور خوش خلق آدمی ہیں ۔قد وقامت میں متوسط اندام ہیں۔رنگ گورا،آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز ہیں ۔لمبی ناک ، چہرے کا نقشہ کھڑا ہے اور بدن میں پھرتی پائی جاتی ہے۔چہرے کے نقش ونگار مجموعی طور پر خوش نما ہیں،آواز بلند اور خوش آئند ہے۔

**غذا:**

غذا میں خالد حسین نے ہمیشہ سادگی برتی ہے اور اعتدال سے کام لیا ہے۔وہ سیدھی سادی غذا ہی کو پسند فرماتے ہیں۔اپنے ایک انٹرویو میں انہوں نے پسندیدہ غذا کے بارے میں یوں بتایا ہے کہ:

''میری پسندیدہ غذا میں دال، چاول اور روٹی شامل ہیں۔اس کے علاوہ مجھے

گوشت اور سبزی بھی بے حد پسند ہیں''۔5

## لباس:

لباس میں بھی انہوں نے ہمیشہ سادگی برتی ہے۔وہ سادہ لباس پہننا پسند کرتے ہیں۔گھر پر وہ اکثر سفید رنگ کا پاجامہ اور کرتہ پہنتے ہیں۔جب گھر سے باہر کسی دعوت ،تقریب یا ادبی محفلوں میں جاتے ہیں تو کوٹ ،پینٹ ،قمیض اور ٹائی (Coat,Pant ,Shirt & Tie) پہن کر جاتے ہیں۔اپنے ایک انٹریوں میں انہوں نے پسندیدہ رنگ کے بارے میں یوں بتایا ہے:

''مجھے زیادہ تر سفید رنگ کے کپڑے پسند ہیں جو مجھے نہایت زیب دیتے ہیں''۔6

## خلوص ومحبت:

خالد حسین ایک انتہائی مخلص انسان ہیں۔ان کا لہجہ نہایت مخلصانہ ہوتا ہے۔وہ خُلوص ،محبت اور ہمدردی کا زندہ مجسمہ ہیں۔وہ جس کسی سے بھی ملتے ہیں بڑے خلوص ومحبت سے پیش آتے ہیں۔بہ الفاظِ دیگر وہ بلاتفریق مذہب وملت ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں اور سب کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔

## اخلاق اور انسانی اقدار کا حامل:

خالد حسین با اخلاق اور بامروت انسان ہیں۔انسانیت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔وہ اعلیٰ انسانی اقدار پر یقین رکھتے ہیں اسی لیے ان کی کہی ہوئی بات دل میں اُتر جاتی ہے۔ان کی فطرت میں ظرافت ،بذلہ سنجی ،زندہ دلی اور شوخی مزاج بدرجہ اتم موجود ہیں۔زندگی کے ہر موڑ پر اسی سے کام لیا کرتے ہیں۔

## خوددار:

خالد حسین بے حد خوددار ہیں لیکن منکسر المزاجی ان کا خاص وصف ہے بہ الفاظِ دیگر خوددار اتنے کہ

دوست ودشمن کی بھی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔خُدا کے سوا انہوں نے کبھی کسی کے سامنے دست دراز نہیں کیا۔ان کا ایقان ہیں کہ دینے والا تو پروردگار ہے اس لیے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں ہے انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا پسند نہیں کیا ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کی مدد کی ہے۔قناعت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔خالد حسین کی شخصیت میں خودداری بہت ہے۔ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے خالد کفایت لکھتے ہیں:

''خالد حسین کی شخصیت مختلف ومتضاد کیفیات واحساسات کی آئینہ دار ہے۔کبھی
وہ انتہائی نرم دل ہے تو کبھی حد سے زیادہ سخت گیر،ٹوٹنے کی اسے پرواہ نہیں لیکن
جھکنا اس کے لئے ناممکن ہے۔۔۔''7؎

## معاصرین کے ساتھ برتاؤ:

خالد حسین کا رویہ معاصرین کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ وہمدردانہ رہا ہے۔وہ ہر کسی سے بڑی فراخدلی سے ملتے ہیں۔انہوں نے خود کو بغض وحسد سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔وہ کسی صلہ وستائش کی پرواہ نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ معاصرانہ چشمک سے ہمیشہ دور رہے ہیں اور خاموشی سے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

## بحیثیت دوست:

خالد حسین انتہائی دوست نواز ہیں۔وہ دوستوں کے دوست ہیں۔دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے میں انہیں معراج حاصل ہے۔ان کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں نور شاہ یوں رقم طراز ہیں:

''خالد حسین کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوست بنانے اور تعلقات بڑھانے
کے فن سے بخوبی واقف ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس کے دوست
واحباب کی تعداد بہت زیادہ ہے''۔8؎

خالد کفایت ان کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دوست بنانے کا فن اسے خوب آتا ہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ دوستی نبھانے کے لئے وہ آخری حد تک جانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے ،امیر غریب ،ادنیٰ اعلیٰ کی اس کے نزدیک کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اپنی بیشتر کہانیوں کے پلاٹ اُسے انہی لوگوں سے ملے ہیں جنہیں ''سڑک چھاپ'' کہا جاتا ہے۔ اس کا ہر ایک دوست یہی سمجھتا ہے کہ وہی خالد حسین کے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اور اس کا یہی کمال ہے کہ وہ کسی کو بھی اس خوش فہمی کے جال سے نکلنے نہیں دیتا۔ خواہ خود اسے کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے وہ دوستی کے نازک آبگینے کو ٹھیس نہیں لگنے دیتا''۔9

## بحیثیت والد:

خالد حسین خلوص ،محبت اور ہمدردی کا عملی پیکر ہیں۔ بحیثیت والد انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش اور اچھی تعلیٰ وتربیت میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ وہ نہایت شفیق ،محبت کرنے والے اور اپنے بچوں پر جان چھڑکنے والے والد ہیں۔ جس طرح خالد حسین کو اپنی کہانیاں اور مسودے عزیز ہیں اس سے کہیں زیادہ انہیں اپنے بچے عزیز ہیں۔ خاص طور پر ان کا چھوٹا بیٹا ،یاسر عمران انہیں بے حد عزیز ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کی خوشیوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔

## بحیثیت شوہر:

خالد حسین ایک وفادار، نیک سیرت اور فرمانبردار شوہر ہیں۔ وہ اپنی چہیتی بیوی کا ہر وقت خیال رکھتے ہیں۔ ملازمت کے دوران بھی وہ اپنے گھریلو فرائض سے غافل نہیں رہے۔ بیوی اور ان کی ضرورتوں کا حد درجہ خیال رکھنا ،انکساری وخندہ پیشانی سے بات کرنا اور ان کے دکھ درد میں شریک رہنا بحیثیت شوہر وہ اپنا فرض

سمجھتے ہیں۔اس لحاظ سے وہ ایک کامیاب شوہر ہیں۔

غرض خالد حسین جملہ عمدہ صفات کا مجموعہ ہیں۔وہ انتہائی متین اور سنجیدہ انسان ہیں۔ان کی فطرت میں ظرافت، بذلہ سنجی، زندہ دلی، اور شوخ مزاجی بدرجہ اتم موجود ہیں۔وہ نہایت پاکیزہ خیال، متقی، پرہیزگار اور وضعدار انسان ہیں۔وہ اپنے اصول اور وضعداری کے پابند ہیں اور حتی الامکان اُسے نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔قناعت اور توکل ان میں حد درجہ ہیں۔مختصراً خالد حسین مکمل انسانی صفات کا مجموعہ ہیں۔ان کی شخصیت میں شرافت، خلوص، محبت اور ہمدردی، انکساری، خودداری اور شریف النفسی ایسی صفات ہیں جس کا ہر کوئی اعتراف کرتا ہے۔ان کی انہیں خصوصیات کی بدولت ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اچھے انسان ہیں۔

# حوالہ جات

1۔خالد حسین، اشتہاروں والی حویلی، ذاکر پبلی کیشنز، جموں، ص

2۔سہ ماہی لمحے لمحے ،نومبر 2013ء، بدایوں، یوپی، ص112

3۔خالد حسین، اشتہاروں والی حویلی، ذاکر پبلیکشنز جموں، 1991ء، ص40

4۔خالد حسین، ستی سرکا سورج، پنجاب ادبی سنگت، جموں، 2011ء، ص36-35

5 خالد حسین، شخصی انٹرویو، انٹرویو، قمر سجاد، 8 اپریل 2014ء

6۔شخصی انٹرویو، خالد حسین، انٹرویور، قمر سجاد، 8/اپریل 2014ء

7۔شخصی انٹرویو، خالد حسین، انٹرویور، قمر سجاد، 8/اپریل 2014ء

8۔خالد حسین، اشتہاروں والی حویلی، ذاکر پبلیکیشنز، جموں 1991ء، ص15

9۔خالد حسین، ستی سرکا سورج، پنجاب ادبی سنگت، جموں 2011ء، ص35

10۔خالد حسین، اشتہاروں والی حویلی، ذاکر پبلیکیشنز، جموں 1991ء، ص14

☆☆☆☆

# باب دوم

# خالد حسین کے معاصر افسانہ نگار

## خالد حسین کے معاصر افسانہ نگار:

اردو افسانے کی تاریخ جموں وکشمیر اور اس سے وابستہ افسانہ نگاروں کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔اس ضمن میں رتن ناتھ سرشار، سعادت حسن منٹو اور کرشن چندر کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی ایک روشن روایت رہی ہے۔یہاں کے افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے عہد میں یہاں کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، جنسی ونفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں میں مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

عصر حاضر میں بھی ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے کا تخلیقی سفر بڑی سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔عصرِ حاضر کے افسانے نگاروں میں خالد حسین اوران کے معاصر افسانہ نگار جن میں نورشاہ، آنند لہر، مشتاق احمد وانی، ترنم ریاض، دیپک بدکی، پروفیسر ظہورالدین، پرویز مانوس، راجہ نذر بونیاری، امین بنجارا، مشتاق مہدی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

### ا۔نورشاہ:

خالد حسین کے معاصرین میں نورشاہ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔نورشاہ کا اصلی نام نور محمد شاہ ہے لیکن ادبی دنیا میں وہ 'نورشاہ' کے نام سے معروف ہیں۔ان کی ولادت سرینگر کے ڈلگیٹ علاقے میں 9/جولائی 1936ء کو ہوئی۔ابتدائی تعلیم اسلامیہ مڈل اسکول درگجن کشمیر سے حاصل کی۔اس کے بعد بی۔اے کیا۔بی۔اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔مختلف عہدوں پر فائز رہ کر چیف ایگزیکیٹو آفیسر جے اینڈ کے انرجی ڈیولپمنٹ ایجنسی کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔آج کل وُ اُردو اکیڈمی کشمیر' کے صدر کی حیثیت سے اُردو زبان کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

نورشاہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 22 (بائیس) سال کی عمر میں کیا۔ان کی پہلی کہانی ''نلنی'' عنوان کے تحت ادبی ماہنامہ ''شمع'' نئی دلی کے جنوری 1958ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔یہ وہ زمانہ تھا جب اردو افسانہ عالمِ شباب میں قدم رکھ رہا تھا۔اس کے بعد ان کی کہانیاں مختلف جرائد میں چھپنے لگیں۔انہوں نے

رسالہ 'دیہات سُدھار' کی ادارت کئی برسوں تک کی ۔1959ء میں جب ہمارا ادب میں ریاست کے ادیبوں اور شاعروں کی سال کی بہترین تخلیقات اور نگارشات کا پہلا انتخاب شائع ہوا تو ان کا افسانہ ''گلاب کا پھول'' شاملِ اشاعت کیا گیا۔اس انتخاب کے ترتیب کار پروفیسر حامدی کاشمیری مجموعے کے حرفِ اول میں ''نورشاہ'' کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بے گھاٹ کی ناؤ'' کا خالق نورشاہ نقلی نسوانی لبادہ اتار کر اب اصلی صورت میں ہمارے سامنے آرہا ہے اور ہماری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہا ہے''۔1

پروفیسر عبدالقادر سروری اس اسرار سے پردہ ہٹاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''نورشاہ پہلے ''شاہدہ شیریں'' کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔اس فرضی نام کو اختیار کرنے کا سبب وہ ایڈیٹر حضرات کی عجیب نفسیاتی افتاد بتاتے ہیں۔چنانچہ پہلے جب وہ اپنے نام سے رسالوں کے لئے افسانے بھیجتے تھے تو ایڈیٹر حضرات انہیں لوٹا دیتے تھے۔لیکن بعد میں ان کے یہی افسانے شاہدہ شیریں کے نام سے نہایت عزت کے ساتھ شائع کیے جانے لگے''۔2

نورشاہ نے اپنے ابتدائی ادبی سفر کے دور میں یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ ایک تخلیقی ساحر ہیں۔نورشاہ ریاست جموں وکشمیر کے نامور اور معتبر افسانہ نگار ہیں جو سالہا سال سے ریاستی ادب پر حاوی رہے ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صرف افسانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے باقاعدہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں لیکن انہیں شہرت ومقبولیت افسانوں کی وجہ سے ہی ملی۔وہ اپنے تمام ہم عصروں میں سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار کی حیثیت سے اُبھرے۔

نورشاہ نے اردو افسانے کو مختلف رنگوں میں رنگا۔اِن کے افسانوں میں زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔وہ ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جس میں ہمیں رنگوں اور تصویروں کا البم نظر آتا ہے۔وہ ایک مصور کی طرح بے زبانی کو زبان دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ہمیں کشمیر اور کشمیر کے حسین نظارے

اپنی پوری بے تکلفی اور رعنائیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔کشمیر کا ذکر کر کے وہ اپنے افسانوں کو کشمیر کی طرح خوبصورت بناتے ہیں۔ان کی اکثر کہانیوں میں گذرے ہوئے موسموں کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے۔ان کے افسانوں میں کشمیر کا حسن ،ڈل جھیل کے پانیوں کی جھلملاہٹ ،دریائے جہلم کی روانی اور گلاب یاسمین اور سنبل کی خوشبوئیں بسی ہوئی ہیں۔وہ انسانی نفسیات اور جنسی موضوعات پر بھی خوب لکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں جنسی کج رویوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں ہمیں رومانیت اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

نور شاہ کے افسانوں کے سات مجموعے زیورِطباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں جن کے نام اس طرح ہیں:

بے گھاٹ کی ناؤ1966ء ویرانے کے پھول 1964ء، گیلے پتھروں کی مہک 1966ء،من کا آنگن اداس اداس،ایک رات کی ملکہ 1969ء، بے ثمر بیج2008ء،آسمان ، پھول اور لہو2009ء ،ان کے علاوہ ''کشمیر کہانی''زیر اشاعت ہے۔

ماہنامہ''تریاق''ممبئی کے شمارہ نومبر 2012ء میں نور شاہ کا ایک افسانہ''کشمیر کہانی 1990ء کے نام سے چھپا ہے جس کا تعلق براہ راست کشمیر عوام کی مفلوج زندگی کے نوحے سے ہے۔

**۲۔آنند لہر:۔**

خالد حسین کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں آنند لہر سب سے زیادہ فعال افسانہ نگار ہیں۔آنند لہر کا اصلی نام شیام سندر ہے۔لیکن ادبی دنیا میں وہ آنند لہر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔وہ 2/جولائی 1951ء کو پونچھ میں پیدا ہوئے۔اگر چہ ان کی جائے پیدائش پونچھ ہے لیکن ایک طویل عرصے سے جموں میں رہائش پذیر ہیں۔انہوں نے گورنمنٹ کالج پونچھ سے 1972ء میں بی۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد 1975ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کیا اور وکالت کو بہ طور پیشہ اپنایا۔اس اعتبار سے وہ نہ صرف ریاستی ہائی کورٹ کے ایک سینئر Senior وکیل سمجھے جاتے ہیں بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی عدلیہ سپریم

کورٹ میں بھی اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔

آنند لہر کی حیثیت اُردو ادب میں ایک فکشن نگار کی ہے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں، افسانہ ''پتھر کے آنسو'' سے کیا جو 1972 میں کالج میگزین میں شائع ہوا۔تب سے وہ باقاعدگی کے ساتھ افسانے، ڈرامے اور ناول لکھتے آرہے ہیں۔ریاست اور بیرون ریاست سے شائع ہونے والے اُردو کے رسائل وجرائد میں آنند لہر کے افسانے سب سے زیادہ چھپتے ہیں۔

آنند لہر کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن کے نام اس طرح ہیں:

نروان، انحراف، سرحد کے اس پار اور کورٹ مارشل۔ان مجموعوں میں شامل تمام افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آنند لہر انسانیت کی اکائی پر کامل یقین رکھتے ہیں۔وہ ذات پات، دین دھرم ،فرقہ پرستی، علاقائیت، تعصب اور امیری وغریبی کی سخت مذمت کرتے ہیں۔وہ اس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ سارے انسان چاہئے وہ دنیا کے کسی بھی علاقے، ملک یا خطے کے کیوں نہ ہوں، قابلِ احترام ہیں اور ایک بہترین معاشرے کی تشکیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی اقدار کو فروغ دیا جائے، کیوں کہ آتما اور پرماتما کے نزدیک انسانی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی۔

آنند لہر کے افسانوں میں ہمیں پیغام انسانیت اور مشترکہ ہندوستانی کلچر وتہذیب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے اپنی بہت سی کہانیوں میں ہندوستان کے بٹوارے کی سخت مذمت کی ہے۔

بقول نامی انصاری:

> ''آنند لہر کے افسانوں کی خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانیت کی اکائی پر کامل یقین رکھتے ہیں، اس کو ملکوں اور خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے کیوں کہ زمین کی سرحدیں بناوٹی ہیں اور انسان کی انسانیت کو سرحدوں سے نہیں ناپا جاسکتا ہے''۔3

آنند لہر کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو چھوٹے سے کینوس پر سمیٹ کر پوری

وضاحت کے ساتھ کھل کر پیش کرتے ہیں ۔ذراسی بات کو افسانوی شکل دینے میں مہارت رکھتے ہیں۔معنویت کے لحاظ سے ان کے افسانوں میں دریا جیسی روانی ہے،ان کے افسانوں کو پڑھ کر کبھی کبھار یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ تو میری تیری ہم سب کی کہانی ہے ۔آنند لہر کی تحریروں پر جدیدیت کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے اکثر و بیشتر کہانیوں میں علامتی اور استعاراتی اسلوبِ بیان اپنایا ہے۔

افسانوں کے علاوہ آنند لہر کے تین ناول اگلی عید سے پہلے 1997ء،سرحدوں کے بیچ 2002ء اور مجھ سے کہا ہوتا 2004ء بھی شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔''نروان ''اور تپسوی کون'' کے نام سے ان کے ڈراموں پر مشتمل دو کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں ۔ان کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کئی ادبی تنظیموں نے انہیں انعامات سے نوازا ہے جن میں میر اکیڈمی لکھنؤ،راجستھان اردو اکیڈمی ،جموں وکشمیر اردو فورم ،ریاست کی معروف تنظیم رسا جاودانی میموریل لٹریری سوسائٹی ،وغیرہ شامل ہیں۔

## ۳۔مشتاق احمد وانی:

خالد حسین کے ہم عصروں میں ایک اہم نام مشتاق احمد وانی کا ہے۔جموں وکشمیر کے ضلع ڈوڈہ کے ایک گاؤں بہوتہ مرمت میں 3/مارچ 1940ء کو جس لڑکے کی ولادت ہوئی۔اس کا نام مشتاق احمد وانی رکھا گیا۔جنہوں نے آگے چل کر ادبی دنیا میں خوب نام کمایا۔انہوں نے دسویں جماعت تک کی تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی۔1980ء میں میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔اس کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد 1988ء میں جموں یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور 1999ء میں مشتاق احمد نے اسی یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس وقت وہ بحیثیت لکچرار کام کر رہے ہیں۔

انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1988ء سے کیا ان کا ایک واقعہ ''احساس خطا'' کے نام سے پہلی

دفعہ ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' میں شائع ہوا۔1989ء میں ان کی پہلی کہانی ''تڑپتے پنچھی'' کے عنوان سے ماہنامہ ''بھیانک جرائم'' ہی کی زینت بنی۔ان کے اب تک دو افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔پہلا افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' کے عنوان سے 2001ء میں شائع ہوا۔اور یہ مجموعہ سولہ کہانیوں پر مشتمل ہیں۔دوسرا افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' ہے جو 2008ء میں شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے میں بارہ (12) کہانیاں شامل ہیں۔ان میں سے اکثر کہانیاں ملک کی مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ان کے علاوہ وانی صاحب کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''اندر کی باتیں'' زیرِ ترتیب ہے۔افسانوں کے علاوہ تنقید و تحقیق کے تعلق سے ان کی چار کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں جن میں تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران (تحقیق وتنقید) 2002ء، آئینہ دار آئینہ (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 2004ء، اعتبار و معیار (تحقیقی وتنقیدی مضامین) 2011ء، اردو ادب میں تانیثیت (تحقیق وتنقید) 2013ء شامل ہیں۔

مشتاق احمد وانی جموں و کشمیر کے وہ ادیب ہیں جنہوں نے بہت ہی کم مدت میں ریاست کے ادبی حلقوں میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ان کے افسانوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مگر اہم مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔وہ رشوت ستانی، جہیز، تعلیمِ نسواں، اخلاقی قدروں کی پامالی اور نئی نسل کی بے راہ روی جیسے مسائل کو اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں ہمیں اپنی ریاست جموں و کشمیر کا عکس نظر آتا ہے۔ان کے افسانوں میں آس پاس اور اطراف و اکناف کی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ان کی کہانیوں میں سادہ، عام فہم اور شستہ زبان ملتی ہے۔وہ روزمرہ اور بول چال کے رائج انداز کو اپناتے ہیں۔وہ عریانیت کے قائل نہیں ہیں۔مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری کے بارے میں، معروف نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ایک مدت سے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔وقتاً فوقتاً ان کی کہانیاں میری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں۔وہ ایک دردمند اور حساس طبیعت رکھتے ہیں۔وہ کشمیری اہلِ زبان ہیں لیکن اُردو میں بھی ان کی پیٹھ مادری زبان سے کم

نہیں۔ان کی انگلیاں معاشرے کی نبض پر ہیں اوران کی کہانیاں آج کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔وہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تنقید نگار اور محقق بھی ہیں''۔4

## ۴۔ترنم ریاض:

خالد حسین کے معاصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ترنم ریاض کا بھی ہے۔ان کی پیدائش 9/اگست،1963ء کو سرینگر میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم گرلز ہائی اسکول کرن نگر سرینگر سے حاصل کی۔اس کے بعد وومنز کالج (Women's College) سرینگر سے گریجویشن حاصل کی۔اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں اسی یونیورسٹی سے بی۔ایڈ اور ایم۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

ترنم ریاض نے اگرچہ اپنے ادبی سفر کا آغاز 1973ء میں کیا لیکن ان کی پہلی کہانی روزنامہ ''آفتاب''میں 1975ء میں شائع ہوئی۔کہانی لکھنے کا یہ سلسلہ آج بھی رواں دواں ہے۔ترنم ریاض تانیثی ادب کی ایک معتبر آواز ہیں۔وہ وادیِ کشمیر کی ایک ایسی ادیبہ ہیں جنہیں اردو،انگریزی،ہندی اور کشمیری زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ترنم ریاض بیک وقت افسانہ نگار،ناول نگار،شاعرہ،مترجم،محقق ونقاد ہیں۔ان کی تصانیف اعلیٰ ادبی معیار کی حامل ہیں۔

ترنم ریاض کا شمار ہندوستان کی اہم خواتین افسانہ نگار میں ہوتا ہے۔ہندو پاک کا شاید ہی کوئی ادبی رسالہ ہوگا جس میں ترنم ریاض کی کہانیاں شائع نہ ہوئی ہوں۔ترنم ریاض کے اب تک چار افسانوی مجموعے یہ ''تنگ زمین'' 1998ء،''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' 2000ء،یمبرزل 2002ء''میرا رختِ سفر''(2008ء)منظر عام پر آچکے ہیں۔افسانوں کے علاوہ تنقید وتحقیق کے تعلق سے ترنم ریاض کی دو کتابیں ''بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب''اور''چشمِ نقش قدم''شائع ہوچکی ہیں۔''پرانی کتابوں کی

خوشبو‘‘2005ءان کا شعری مجموعہ ہے۔وہ مترجم بھی ہیں۔اس تعلق سے ان کی تین کتابیں’سنو کہانی‘‘، ہاؤ س بوٹ پر بلی‘‘، اور گوسائیں باغ کا بھوت‘‘ قابلِ ذکر ہیں۔فریبِ خطائے گل 2008ء میں ان کے چار ناولٹ شامل ہیں۔انہوں نے دو ناول بھی مورتی 2002ءاور برف آشنا پرندے 2009ء کے عنوان سے لکھے ہیں۔

ترنم ریاض کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو افسانے کو نئی جہت اور نت نئے تجربوں سے آشنا کیا ہے۔وہ اکثر نئے اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کرنے کے بعد ان موضوعات کو آپ بیتی اور جگ بیتی میں مدغم کر کے ایک نئے روپ ااور ایک نئے انداز سے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ترنم ریاض کے تقریباً تمام افسانوں میں عورت کے جذبات واحساسات،اس کی محرومیاں،آہیں،آنسو،درود کرب اور گھٹن کے ساتھ ساتھ مردانہ بالادستی کے خلاف بغاوت اور احتجاجی رویہ بھی موجود رہتا ہے۔دوسری بات یہ کہ وہ خود کلامی کے انداز میں کہانی سنانے کی عادی ہیں۔سماج میں جو کچھ اچھا بُرا دیکھتی ہیں،اسے ایک حساس کہانی کار کی طرح قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں کہانی پن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ترنم ریاض ایک جہاں دیدہ خاتون ہیں۔وسیع النظر اور وسیع القلب ہونے کی وجہ سے ان کے افسانوں کا کینوس بھی بے حد وسیع ہوتا ہے۔بقولِ ابوالکلام قاسمی:

> ’’ترنم ریاض ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ ان کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب وثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔مجھے ترنم ریاض کی کہانیوں میں روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ تجربے کا رنگ بھی شامل نظر آتا ہے۔وہ صورتِ حال کو کہانی بنانا جانتی ہیں اور اپنے زمانے کے اسلوبیاتی رویوں سے واقفیت کے باعث کسب فیض بھی کرتی ہیں۔مجھے ترنم ریاض کے پہلے مجموعے ’’یہ تنگ زمین‘‘ کی بیشتر کہانیاں ایک سچے فن کار کی ترجمانی محسوس ہوتی ہیں‘‘۔5

## ۵۔دیپک بُدکی:

دیپک بُدکی کا شمار خالد حسین کے اہم معاصر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔دیپک بُدکی کی پیدائش 15 رفروری 1950ء کو سرینگر میں ہوئی،ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ بزنس گھرانے سے ہیں۔ایم۔ایس۔سی (بوٹنی) اور بی۔ایڈ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انڈین پوسٹل سروس جوائن کی۔چیف پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدے پر کام کرنے کے بعد سنٹرل ٹیلی کمیونی کیشن منسٹری میں بحیثیت ممبر سبکدوش ہوئے۔

عہدِ حاضر میں دیپک کنول جیسے اہم افسانہ نگار کے بعد جس کشمیری پنڈت افسانہ نگار نے نہ صرف ریاستی بلکہ ملکی سطح پر کچھ طویل اور مختصر افسانوں کی اشاعت سے ایک منفرد پہچان اور مقبولیت حاصل کی وہ دیپک بُدکی ہیں۔دیپک بُدکی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 'سلمٰی' نام کی کہانی سے کیا جو 1970ء میں شائع ہوئی۔دیپک بُدکی کے اب تک تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام اس طرح ہیں:'ادھورے چہرے 1999ء'،'چُنار کے پنجے 2005ء'،اور'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' 2007ء۔افسانہ نگاری کے علاوہ دیپک بُدکی تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔اس تعلق سے ان کی دو کتابیں بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری کا سب سے منفرد اور دلکش پہلو ان کا لسانی برتاؤ اور سماجی کجرویوں کی ہو بہو عکاسی ہے جو قاری کے دل کو نہ صرف لمحہ بھر کے لئے سوچنے پر مجبور کرتی ہے بلکہ اس کے ذہن پر ایک دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔معاشرے اور انسانی نفسیات پر ان کی بڑی گہری نظر رہتی ہے۔وہ کہانی کو اکثر صیغہ واحد متکلم میں بیان کرتے ہیں۔اس تکنیک میں ان کا اصلاحی نقطہ نظر علامتوں اور استعاروں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔زماں ومکاں بھی بالکل حقیقی اور عصری ہوتے ہیں۔ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرکے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ ہمیں جھنجھوڑ رہے ہوں کہ آپ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے اور دیکھئے وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونا چاہئے تھا؟ سوچیے،محسوس کیجئے،اور اپنا ردعمل ظاہر کیجئے۔غرض یہ کہ دیپک بُدکی کی عقابی نگاہیں معاشرے میں رونما ہونے والے حالات وواقعات،جذبات واحساسات اور خاص کر انسانی سائیکی کو

ایک نئے انداز سے دیکھتی ہیں۔وہ مبلغانہ بیانیہ میں کہانی نہیں لکھتے بلکہ حالات وواردات سے نتائج اخذ کر کے قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔یہی چیز ان کی کہانیوں کا اہم پہلو بھی ہے۔

## ۶۔پروفیسر ظہورالدین:

خالد حسین کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام پروفیسر ظہورالدین کا بھی ہے۔پروفیسر ظہورالدین 1942ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔انہوں نے اردو اور انگریزی میں ایم۔اے کرنے کے بعد پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کی۔پروفیسر صاحب چند برس قبل جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

پروفیسر ظہورالدین اردو ادب کا ایک معتبر نام ہے۔انہوں نے نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی ایک الگ پہچان قائم کی ہے۔ظہورالدین ایک اچھے محقق،نقاد اور شاعر ہونے کے علاوہ افسانہ نگار بھی ہیں۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''تلافی'' کے نام سے آج سے تقریباً تیس (30) سال پہلے شائع ہوا تھا۔'کینی بلز' کے عنوان سے ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 1981ء میں شائع ہوا۔یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے،پہلے حصے میں ان کے تحریری کردہ روایتی انداز کے افسانے شامل ہیں اور دوسرے حصے میں علامتی انداز کے افسانے پڑھنے کو ملتے ہیں۔اس افسانوی مجموعے کو اتر پردیش کی اُردو اکیڈمی نے 1982ء میں انعام سے نوازا ہے۔ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''آخری کیل'' کے عنوان سے زیر اشاعت ہے۔پروفیسر ظہورالدین ایک اچھے ناقد بھی ہیں اور ادب کے مختلف گوشوں کو ایک الگ لیکن گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔اس تعلق سے ان کی تحریر کردہ کتاب ''جموں خطے میں اُردو زبان وادب کا ارتقاء'' ایک قابلِ ذکر ادبی کارنامہ ہے۔اس کے علاوہ ان کے تحریر کردہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین نئی نسل کے قلم کاروں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

پروفیسر ظہورالدین کے تحریر کردہ افسانوں میں علامت کا صحیح اور پُر معنی ادراک ملتا ہے۔''کینی بلز'' میں بیشتر افسانے علامتی نوعیت کے ہیں۔ان کہانیوں میں بہت حد تک ذات اور داخلی انتشار کے علاوہ

احساسِ تنہائی ،اقدار کی شکست وریخت اورحالات وواقعات کے دردوکرب کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔وہ راست بیانیہ اسلوب میں کہانی لکھنے کے قائل نہیں ہیں ۔ان کا خیال ہے کہ بالکل سپاٹ بیانیہ میں کسی واقعہ، جذبہ،فکروخیال کوکہانی بندکرنا اس لیے مناسب نہیں کیوں کہ اسے قاری کی ذہنی اپج اورشعور کی بصیرت کی راہیں مسدود ہوجاتی ہیں اورخالص علامتی واستعاراتی انداز میں لکھی گئی کہانی بھی قاری کے پلے نہیں پڑتی ،وہ یہی سوچ کے رہ جاتا ہے کہ آخر کہانی کار کہنا کیا چاہتا ہے۔وہ مابعد جدید ادبی نظریات سے بھی متاثر ہوئے جس کے نتیجے میں انہوں نے ایسے افسانے لکھے جن میں مانوس علامتی اور بیانیہ اسلوب کی آمیزش ملتی ہے ۔اس تعلق سے ان کا ایک افسانہ 'آخری کیل' قابلِ ذکر ہے جو ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کے شمارہ مئی 2009ء میں شائع ہوا۔

نصرت چودھری، پروفیسرظہورالدین کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''نئے اورعلامتی افسانے کی روش کے بانیوں میں اہم نام پروفیسرظہورالدین کا ہے۔وہ اُن افسانہ نگاروں میں ہیں جنہوں نے جدیدیت کے اندھے طوفان کو فوراً قبول نہیں کیا بلکہ فنی اورتکنیکی سطح پرافسانوں میں کئے گئے تجربات کا گہرا شعور حاصل کرکے انہیں اپنے افسانوں میں برتا ہے ۔انہوں نے زمانے کے انتشارواضطراب بےمعنویت اور بدلتی اقدارکوفوراًافسانوں کا موضوع نہیں بنایا بلکہ خوب سوچ سمجھ کرنئے افسانے کےفن سے گہری واقفیت رکھنے کے بعد پیش کیا۔۔۔''6؎

## ۷۔پرویز مانوس:

خالدحسین کے معاصرافسانہ نگاروں میں ایک اہم نام پرویز مانوس کا ہے۔پرویز مانوس کا اصلی نام پرویزاحمد بٹ ہے۔وہ6/مارچ1966ءکو پیدا ہوئے۔ایم۔اے تک کی تعلیم حاصل کی ہےاورمحکمہ تعلیم سے

وابستہ ہیں۔

پرویز مانوس کی ابتدائی تعلیم ضلع پونچھ میں ہوئی اوران کی ادبی زندگی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا۔ان کا تعلق بنیادی طور پر جموں کے ضلع پونچھ سے ہے لیکن اب وہ ایک طویل عرصے سے شہر سرینگر میں رہائش پذیر ہیں۔پرویز مانوس بیک وقت افسانہ نگار،شاعراورمترجم ہیں۔پروفیسر مانوس جدید دور کے افسانہ نگار ہیں جو ہم عصر مسائل،حُب الوطنی اور سماجی بے ضابطگیوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔انہوں نے مختصر کہانیاں بھی لکھی ہیں اورفنی کہانیاں بھی۔پرویز مانوس نے اپنی افسانہ نگاری کی شروعات 1985ء سے کی۔ان کا پہلا افسانہ 'احساس' کے نام سے 1989ء میں 'ہندسماچار' میں شائع ہوا۔پرویز مانوس کا پہلا اردو افسانوی مجموعہ ''شکارے کی موت'' 1995ء میں منظرِ عام پر آیا۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مٹھی بھر چھاؤں'' زیر اشاعت ہے۔افسانہ نگاری کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے ''موسم اڑان' کا 1997ء اور 'چاند لمس گلاب' 2004ء میں شائع ہوئے۔'چندا ماما' کے نام سے انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔اس کتاب کو 2006ء میں ریاستی سطح پر انعام سے نوازا بھی گیا۔

پرویز مانوس کے افسانے ان کے تجربات ومشاہدات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں جہاں بہت سے سیاسی،سماجی،تعلیمی اوراخلاقی مسائل موجود ہیں تو وہیں ان کے کچھ افسانے جیسے 'شکارے کی موت'،احساس'، گوشت کا ٹکڑا،'لہو کی مہندی' اور 'فساد' میں حُب الوطنی اور آپسی بھائی چارے کو موضوع بنایا گیا ہے۔پرویز مانوس اپنے اردوگرد پھیلی ہوئی کہانیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔وہ اپنے کرداروں کی ذات اوران کے وجود میں اُتر کر اپنی کہانیوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ان کی اکثر شعری اور نثری تخلیقات میں کشمیراور کشمیریت کی بھرپور عکاسی ملتی ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں امن وآشتی سے بھرپور ماحول کا خواب دیکھتے ہیں۔

## ۸۔راجہ نذر بونیاری:

راجہ نذر بونیاری کا شمار بھی خالد حسین کے معاصر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔یوں تو ان کا اصلی نام

عبدالقیوم خان ہے۔لیکن ادبی دنیا میں راجہ نذر بونیاری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔تحصیل بونیار کے ایک گاؤں ترکانجن میں 2/جنوری 1949ءکوان کی پیدائش ہوئی۔انہوں نے ایم۔اے،بی۔ایڈتک تعلیم حاصل کی اورمحکمہ تعلیم سے وابستہ ہوگئے۔اس دوران صحافت میں بھی ڈپلوما حاصل کیا۔اب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوچکے ہیں۔

راجہ نذر بونیاری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز 1962ء سے کیا۔ان کی پہلی کہانی 1964ء میں ''چاندی کی جھگی'' ماہنامہ'پرواز'میں شائع ہوئی۔اس کے بعد سے وہ مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔ان کے بہت سارے افسانے روزنامہ 'آفتاب'اورروزنامہ 'ہندسماچار'میں شائع ہوچکے ہیں۔تاحال انہوں نے تقریباً دوسوکہانیاں لکھی ہیں جن میں اکثر کہانیاں اپنے زمانے کے مشہور جریدوں جیسے شمع، بیسوی صدی ،شبستاں، ہما،شیرازہ، یاسمین باجی،نوائے اردواورلفظ لفظ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔وہ بچوں کے لئے بھی لکھتے رہے ہیں۔اس سلسلے میں بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کہانیاں،کھلونا،پھلواڑی،ٹافی،گل بوٹے ،شگوفہ اور کہکشاں نامی رسائل میں جگہ پاچکی ہیں۔وہ صحافت میں بھی بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ایک کالم نویس کی حیثیت سےان کے کالم مقامی اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

راجہ نذر بونیاری کا پہلا افسانوی مجموعہ'دوسرا آدمی'1971ء میں شائع ہوا۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ'یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں'2008ء میں شائع ہوا۔ان کے افسانوں میں فکروشعور کی بالیدگی اوربصیرت بخوبی ملتی ہے۔ان کے افسانوں کو پڑھ کرانتظارحسین کے افسانوں کی یادتازہ ہوجاتی ہے۔ان کے افسانوں میں مکالمہ نگاری اورچست کرداروں کی حرکات وسکنات اثرانگیز ہوتی ہیں۔علاوہ ازیں نذرصاحب کے افسانوں میں ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کے مسائل ومصائب کی جھلکیاں بھی نظرآتی ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں عوامی مسائل اورالجھنوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ایک مرتبہ عصمت چغتائی نے ایک ادبی محفل میں یہاں تک کہا تھا کہ نذرصاحب کی اکثر کہانیوں میں کہانی پن اوردوسرے لوازمات موجود ہیں۔

## ۹۔امین بنجارا:

خالد حسین کے معاصر افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام امین بنجارا کا ہے۔یوں تو ان کا اصلی نام نصیر احمد قریشی ہے لیکن ادبی دنیا میں وہ امین بنجارا کے نام سے معروف ہیں۔آپ 26/نومبر 1961ء میں پیدا ہوئے۔آپ پیشے سے ایک استاد ہیں۔

امین بنجارا کا شمار ریاست جموں وکشمیر کی اُن علمی وادبی شخصیات میں ہوتا ہے جو اپنی اُردو دوستی،ادب نوازی،اور عالمانہ بصیرت وفنکارانہ چابکدستی کے بل بوتے پر ایک بُلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔آپ بیک وقت ایک افسانہ نگار،نقاد اور صحافی ہیں۔صحافی کے طور پر امین بنجارا کافی شہرت ومقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔انہوں نے تحقیق وتنقید میں بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔انہوں نے اردو ادب کی معروف شخصیتوں پر کئی تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے ہیں جن میں محمد یوسف ٹینگ،ابوالکلام آزاد،جگن ناتھ آزاد،رسا جاودانی،پرتپال سنگھ بیتاب،پروفیسر شہاب عنایت اللہ ملک وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے اپنے استاد محترم ماسٹر موہن لال گپتا پر ایک سوانحی کتاب ''گمنام شخصیت'' کے عنوان سے لکھی ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے کئی ایسی کتابیں مرتب کی ہیں جو ان کی تنقیدی وتخلیقی شعور کی غمازی کرتی ہیں۔سماجی،ادبی وعلمی خدمات کے لئے انہیں بہت سارے انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔امین بنجارا کا اب تک ایک افسانوی مجموعہ ''الاؤ'' کے عنوان سے 1995ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں آٹھ افسانے شامل ہیں۔امین بنجارا کے افسانے سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں،فرقہ وارانہ فسادات اور انسانی زندگی کے عدمِ تحفظ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کا ایک افسانہ 'امن کے لئے' قومی یکجہتی اور حُب الوطنی کے حوالے سے نہایت جاندار اور اثر انگیز ہے جس کا موضوع ملک،سماج اور زندگی میں امن کی بحالی ہے۔امین بنجارا عام لوگوں پر ہو رہے ظلم وتشدد اور زیادتیوں کو بھی اپنے افسانوں میں سمونے کی بھرپور کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں ریاست جموں وکشمیر کی مشترکہ تہذیب کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

## ۱۰۔مشتاق مہدی:

مشتاق مہدی کا شمار بھی خالد حسین کے معاصر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ 13/فروری 1952ء کو خانیار، سرینگر میں پیدا ہوئے۔انہوں نے 1972ء میں گریجویشن مکمل کی اور محکمہ صحت عامہ میں ملازم ہوگئے۔اب ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

مشتاق مہدی کی پہلی کہانی 'کمینہ' کے عنوان سے ماہنامہ 'فلم اسٹار (ممبئی) میں 1974ء میں شائع ہوئی۔اس زمانے میں وہ مشتاق احمد مشتاق کے نام سے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔1974ء میں انہوں نے دواور دوستوں کے تعاون سے افسانوں کا ایک مجموعہ ''مٹی کے دیے'' شائع کرایا۔اس مجموعے میں چودہ افسانے شامل ہیں۔ان میں سے چھ افسانے کشمیری زبان میں اور باقی آٹھ اُردو میں ہیں۔مشتاق مہدی نے اپنے پانچ افسانے اُردو میں قلمبند کئے ہیں۔ادبی حلقوں میں افسانوں کا یہ حسین مجموعہ اس لئے ایک چونکا دینے والا عجوبہ ثابت ہوا کیوں کہ وہ بیک وقت دو زبانوں کی نمائندگی کرتا تھا۔اس مجموعہ کی کلیدی کہانی ''مٹی کا دیا'' خود مشتاق مہدی ہی کی تحریر کردہ ہے۔

انہوں نے اس کہانی میں معاشرے کے دامن پر لگے بدنما دھبوں کو اجاگر کرنے کے علاوہ اوباش قسم کے مردوں پر طنز کے تازیانے برسائے ہیں۔اس مجموعے کے دوسرے افسانوں جیسے 'نشہ اور ٹھوکر، احساس کا گھاؤ اور پاگل' کے عنوان بھی اچھوتے اور انفرادیت کے حامل ہیں۔2010ء میں مشتاق مہدی کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''آنگن میں وہ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔مشتاق مہدی اب تک قریب قریب ستر (70) کہانیاں لکھ چکے ہیں۔لیکن 'آنگن میں وہ' کے لیے انہوں نے صرف اکیس کہانیوں کا انتخاب کیا ہے۔اس کے علاوہ مشتاق مہدی نے ریڈیو کے لیے بعض اچھے ڈرامے بھی تحریر کئے ہیں۔مثلاً ڈرامے 'خواب' اور 'کالے نگر میں' ان کے اہم ڈرامے ہیں۔

مشتاق مہدی کے افسانے ان کے تجربات اور احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ان کے افسانوں میں زندگی کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔لیکن کبھی کبھار مشتاق مہدی خود بھی اپنے افسانوں میں جان بوجھ کر یا انجانے

میں اپنے پڑھنے والوں کے لئے الجھاؤ پیدا کرتے ہیں ۔لیکن مہارت ،باریکی ،اور برجستگی کے ساتھ ۔وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں اورانسانی رشتوں کی کڑواہٹ سے بھرپورسچائیوں کواپنی کہانیوں میں پیش کرتے ہیں۔

اس طرح خالدحسین کے معاصرافسانہ نگاروں کے اس تعارف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری کی طرف بہت سے ادیبوں نے توجہ دی ہے اورافسانہ نگاری کی ایک مضبوط روایت کوفرغ دینے میں اہم کردارادا کیا ہے۔ان افسانہ نگاروں کی خدمات کے اس جائزے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف عصری مسائل کواپنے افسانے میں جگہ دی ہے بلکہ اسلوب وتکنیک میں بھی تجربے کی سعی کی ہے۔اس طرح اردوادب کے فروغ میں خالدحسین اوران کے معاصرافسانہ نگاروں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

☆☆☆☆

# حوالہ جات


1۔ ہمارا ادب 1959ء، مرتبہ حامدی کاشمیری، ص13

2۔ کشمیر میں اردو، عبدالقادر سروری، ص223

3۔ ماہنامہ ''آج کل، نئی دہلی، جولائی 2004ء، ص30

4۔ مشتاق احمد وانی۔ میٹھا زہر، 2008ء، ص8

5۔ شیرازہ، جلد 34، شمارہ 6-7، ص78

6۔ شیرازہ جلد 34۔ شمارہ 6-7، ص78

# تیسرا باب

## خالد حسین کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

خالد حسین کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر پنجابی کے افسانہ نگار ہیں اور اس حوالہ سے برِصغیر ہندو پاک کے پنجابی ادبی حلقوں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر پنجابی کے افسانہ نگار ہیں لیکن اردو زبان وتہذیب کے دلدادہ ہونے کے سبب ایک اچھے کہانی کار کی حیثیت سے اُردو کے ادبی حلقوں میں بھی ایک منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اُردو میں خالد حسین کے اب تک تین افسانوی مجموعے ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' (1981)، ''اشتہاروں والی حویلی'' (1991)، اور ''ستی سر کا سورج'' (2011) منظر عام پر آ چکے ہیں۔اب یہاں ان کے افسانے کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

## موضوعات:

افسانے میں موضوع کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ کیوں موضوع اگر اچھوتا، نیا اور متاثر کن ہے تو افسانہ بھی کامیاب اور یادگار ہوگا۔اگر موضوع ہی پامال اور کمزور ہوگا تو افسانہ بھی کمزور ہوگا۔افسانے کا موضوع ہماری حقیقی زندگی سے ہی متعلق ہونا چاہئے۔ یوں تو ''موضوع'' کے حوالے سے کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔افسانہ نگار اس معاملے میں آزاد ہے کہ وہ جس موضوع پر چاہے ''افسانہ'' لکھے۔کسی نے بجا لکھا ہے کہ افسانے کا اپنا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہوتا۔دنیا اور انسانی زندگی سے متعلق کوئی بھی واقعہ، جذبہ ،احساس، تجربہ اور مشاہدہ اس کا موضوع بن سکتا ہے۔گویا انسانی زندگی جتنی وسیع ہے اتنی ہی وسعت افسانے کے موضوعات میں پائی جاتی ہے۔جو زندگی کے سچے، حقیقی اور فطری مرقعے پیش کرتے ہیں۔ان کا مقصد زندگی کی وسعتوں میں سمٹی ہوئی تمام موجودات کی تشریح وضاحت پیش کرنا ہے۔ان کے یہاں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے مشاہدات وتجربات سمیٹے ہوتے ہیں۔جن کے ذریعے انفرادی واجتماعی زندگی کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔

موضوع پورے افسانے کی روح ہوتا ہے۔ یہ کردار، پلاٹ، زمان ومکاں، وحدتِ تاثر اور اسلوب

تمام اجزا کو متاثر بھی کرتا ہے اور متحد بھی رکھتا ہے۔اس لیے افسانہ نگار موضوع کے انتخاب میں محتاط ہوتا ہے۔

خالد حسین کے افسانوں میں زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر تعینات فوجیوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کا قتل ،انسان کی عیاری ومکاری ،خودغرضی اور مرد وزن کے بے جوڑ رشتوں کے باعث جنسی بے راہ روی یا جنسی الجھنوں کا فن کارانہ بیان موجود ہے۔ان تمام موضوعات کے علاوہ کشمیر میں پھیلی دہشت گردی ،علاحدگی پسند گروپ اور فوجی مظالم کو بھی انہوں نے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کُھردری سطح اور گردوپیش کے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ان کی کہانیاں عصرِ حاضر کے اقتصادی ،سماجی اور سیاسی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں لیکن ان کی اکثر کہانیوں کا موضوع ذات کا کرب ہے۔وہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

> ''میری کہانیوں میں آج کے عہد کا المیہ ہے۔ملک کی تقسیم کے زخم ہیں۔بڑی طاقتوں کی بے رحم سازشوں کی داستانیں ہیں۔ان کی کہانیوں میں بھارت اور پاکستان کی دائمی رنجش کی وجہ سے کشمیر میں پھیلی تباہی اور موت کا تانڈو ملے گا،یتیموں اور بیواؤں کی آہیں ملیں گی۔لُٹی عصمتوں کی چیخیں ملیں گی۔بے سروسامانی کے قصے ملیں گے''۔1

اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر حامدی کاشمیری خالد حسین کے افسانوں کے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خالد حسین نے جب بھی کسی موضوع کا انتخاب کیا ہے تو اسی ماحول کو مدِّنظر رکھ کر کئی کئی دن تک اس پر کام کیا ہے تبھی اسے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ گردوپیش کی معاشرتی ،سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات اور کھردُرے پن کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔لیکن لکھنے کے عمل میں وہ موضوعی پیش کش سے زیادہ شخصی تاثر پذیری کی

دریافت سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔اس طرح سے افسانہ اپنی تخلیقی حیثیت قائم کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے ۔یہ افسانہ فن کے مروجہ لوازم کو سختی سے نہ پورا کرتے ہوئے بھی اپنے وجود کا جواز فراہم کرتا ہے۔اس لیے کہ یہ فنکار کے داخلی وجود سے برآمد ہوتا ہے ،اوراس کے فکرونظر کی سچائی کا احساس دلاتا ہے ۔یہ افسانہ،اپنی شکل وصورت بھی خود متعین کرتا ہے''۔2

خالد حسین کے افسانوں کا یہاں تفصیلی تجزیہ پیش کیا جارہا ہے۔

**افسانہ ''ستی سرکا سورج''** میں خالد حسین نے میلی ٹینسی کے بحرانی دور میں یعنی 1990ء کے بعد ،کشمیر کے عبرتناک حالات اوران سے پیدا شدہ صورت حال کو بنیادی موضوع بنایا ہے ۔اس کے علاوہ اس افسانے میں کشمیر کی ایک برگزیدہ ہستی اور معروف صوفی شاعر حضرت شیخ نورالدین ولیؒ (نندرشی) کی روحانی تعلیمات اور پاک مشن کو ہمارے بکھرے ہوئے معاشرے میں ازسرِنو رائج کرنے کی کوشش کا اظہار بھی کیا گیا ہے ۔'ستی سرکا سورج' میں افسانہ نگار نے شیخ نورالدین ولیؒ کی روحانی تعلیمات اورانسان دوستی کے جذبے کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنہیں ستی سرکا سورج کہا ہے ۔کیوں کہ تاریخی پسِ منظر میں کشمیر کو کسی زمانے میں 'ستی سرکا سورج' بھی کہا جاتا رہا ہے۔افسانہ نگار نے نندرشی کو سورج کی علامت کے طور پر برتا ہے۔1990ء کے بعد کشمیر کے پُرآشوب حالات میں مشترکہ تہذیب وثقافت کے اُس مینارہ نور کے مسکن کو کس طرح نذرِآتش کردیا گیا،ان تمام دردناک اورحیاسوز صداقتوں کو خالد حسین نے مذکورہ افسانے میں بے نقاب کیا ہے۔ایک اقتباس بطور نمونہ پیش ہے:

''۔۔۔پاپی صرپاپ کے ہوئے نہ مائی کے نہ باپ کے ہوئے ۔گھروں میں روز ماتمی چٹائیاں بچھنے لگیں ۔بارود کے کھیل میں مکان جلے ۔مندر،مسجد اور خانقاہیں جلیں ۔سنت فقیروں کے حُجرے جلے اورایک دن اِس بارود کے کھیل میں نندرشی

کا مزار بھی جل گیا۔ اُس کا آباد چرار بھی جل گیا۔ آگ اور دھوئین سے ساری دھرتی کالی ہوگئی ۔خیر و برکت سوالی ہوگئی ۔چُپ کے سناٹے نے ستی سر کو گھیر لیا۔خوشیاں ،نصیبے روٹھ گئے ۔رحمت کے دریا سوکھ گئے ۔دن ماتم میں ڈوب گئے اور راتیں درد کے عذاب میں ۔ہر گھر کا سوگ ہر دل کا روگ بن گیا۔طاقت اور دہشت نے اپنی بھوک مٹائی ۔لہو کے پیالوں نے راکھشوں کی پیاس بجھائی ۔''3

**افسانہ ''لکیر''** میں تقسیم ہند سے پیدا شدہ حالات اور مسائل کو بڑی بے باکی کے ساتھ موضوع بنایا گیا ہے۔1947ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو تقسیم کے ساتھ ہی ہجرت اور بے گھری کے مسائل پیدا ہوئے ۔خون ریزی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ ہزاروں لوگ مارے گئے ۔ پورے ملک کی طرح ہماری ریاست جموں و کشمیر میں بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ۔دونوں اطراف کے غریب عوام بے بسی اور لاچاری میں اپنے اپنے گھروں اور احباب و رشتہ داروں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے ۔

**کہانی ''لکیر''** میں سجاول اور صابری کے عشقیہ جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگی میں ہجرت در ہجرت سے جو دُوریاں پیدا ہوئی ہیں وہ تمام المناک صورت حال قاری کو آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے یعنی دو لوگ ملن اور جدائی کے درد و کرب سے گذرنے کے بعد زندگی کے کس موڑ پر دم توڑ دیتے ہیں اور یہ تمام مایوس کن حالات محض تقسیم ہند کے باعث وقوع پذیر ہوئے ہیں ۔انہیں حالات کو دردناک انجام کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔

**''پریم کھیلن کا چاؤ''** خالد حسین کا نہایت ہی عمدہ اور بہترین افسانہ ہے ۔یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں انسانی رشتوں کی ناپائیداری کے احساس کو اُجاگر کیا گیا ہے۔مرزا ہمایوں بیگ کا کردار ہمایوں بادشاہ کے مشابہ ہے جس کے بیٹے اس کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں ۔اس کہانی میں ہمایوں ایک محنتی انسان

ہوتا ہے۔جس نے اپنی محنت ومشقت کی وجہ سے سماج میں اپنا ایک منفرد اور اہم مقام حاصل کیا ہوتا ہے۔اس نے اپنی اولاد کو بڑی محنت اور لاڈ پیار سے پالا اور انہیں وہ سب کچھ عطا کیا جو ایک والد کی ذمہ داری ہوتی ہے یہاں تک کہ اُن کا بیاہ بھی اپنے خرچے سے کروائی ہیں۔لیکن اس کے نکمے بیٹے اُس کے کندھوں پر چڑھ کر دھاڑتے رہتے ہیں۔ایک طرف جہاں ہمایوں کا کردار اولاد کو سب کچھ مہیا کرتا ہے وہیں دوسری جانب اس کو اولاد کی طرف سے ذرا سا سُکھ بھی نہیں ملتا بلکہ اُلٹا اُسے کئی دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔یہ سب کچھ دیکھ کر ہمایوں اب اپنی بچی ہوئی زندگی کو ضائع نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ فقیری چولا پہن لیتا ہے اور عشقِ حقیقی کی جستجو میں نکل پڑتا ہے کیوں کہ عشقِ حقیقی ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو چین وسکون فراہم کرتی ہے۔خالد حسین کی یہ پوری کہانی ہمارے سماج میں درپیش مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرتی ہے۔

**''ایک میرے بندے کی کہانی''** خالد حسین کا ایک اہم افسانہ ہے۔اس کہانی میں اس بات کو موضوع بنایا گیا ہے کہ سرکاری دہشت گردی ہی غیر سرکاری دہشت گردی کو جنم دیتی ہے اس کہانی کے تمام کردار واقعات ،اور مقامات حقیقی ہیں اس کہانی میں افسانہ نگار نے منظور کے کردار کے ذریعہ ریاست میں ہورہے ظلم وتشدد کی عکاسی کی ہے۔منظور کا کردار ایک ایسے بے بس اور مجبور آدمی کا کردار ہے جو پولیس اور فوجیوں کے تشدد کا نشانہ بنتا ہے اور پھر تنگ آکر ملی ٹینٹوں کے گروہ میں شامل ہوجاتا ہے لیکن آخر کار ملی ٹینٹو ں ہی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔غرض ''ایک مرے بندے کی کہانی'' میں ریاست جموں وکشمیر میں پچھلے بیس سالوں سے ہورہے خونین واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

**افسانہ'' آدمی کے اندر چھپا آدمی''** خالد حسین کا نہایت ہی عمدہ افسانہ ہے۔اس افسانے میں ملی ٹنیٹوں کی مردہ ضمیری کو نہایت موثر انداز میں بیان کرکے جہاد اور فساد جیسے موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کہانی میں ضمیر احمد کی بے باکی ،خودداری اور حق گوئی کو بیان کیا گیا ہے وہ حوصلہ افزا اور روشن خیال ذہنیت رکھتے ہیں اور ایک جذباتی آدمی ہے، جو اپنے طبقہ میں ہورہی ناانصافیوں کے لئے حکومت اور اکثریتی طبقے کو ذمہ دار گردانتا ہے اور اس کے خلاف بولتا رہتا ہے لیکن ایک دفعہ جب ملی ٹینٹ اس کے ڈرائیور تیج رام

کو، جو کہ اس کہانی نمائندہ کردار ہے اور جس کا قصور یہ ہے وہ پیدائشی طور پر ہندو ہے، مارنے لگتے ہیں اس وقت ضمیر احمد اپنی جان کی پرواہ نہ کیے بغیر ملی ٹینٹوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ڈرائیور تیج رام کو ان کے نرغے سے چھڑانے کے لئے بولتا ہے۔اس کے مکالموں سے اس کی شخصیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے ۔''ہمیں ایسی آزادی کی ضرورت نہیں جس میں دوسرے مذہب وعقیدہ کے ماننے والوں کو اپنے مرضی کے مطابق جینے کا حق نہ ہو،ہم بیڑیوں کے جنگل میں نہیں رہتے ہم انسان ہیں اور انسانیت کے اصولوں کے مطابق جینا چاہتے ہیں۔ہم خدا سے ڈرنے والے لوگ ہیں،تم بھی اللہ سے ڈرو۔موت ہندو یا مسلمان نہیں دیکھتی۔اللہ کا فرمان ہے کہ زمین پر رہنے والی مخلوق پر رحم کرو''۔اس طرح ضمیر احمد سماج کے اس طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے جو ہوش کھو کر جوش میں باتیں کرتا ہے لیکن جوں ہی جوش اور ہوش ٹھکانے لگتے ہیں تو اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ انسان کو انسان سے دوستی کرنی چاہیئے۔

**کہانی ''دیوار پر لکھے حروف''** مختصر سی کہانی ہے۔جس میں کہانی کار نے علامتی انداز میں ہندوستان اور پاکستان کی باہمی کشمکش کو موضوع بناتے ہوئے ایک تشویش ناک صورت حال کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرانے کی سعی کی ہے۔اس میں دو بھائیوں کی رقابت دراصل دو ملکوں کی رقابت کا علامتی اظہار ہے۔اس کہانی میں راوی اور ان کا دوست اگنی شیکھر باہمی گفتگو کے انداز میں اپنی اپنی رائے اور سوچ سے دونوں ممالک میں پیدا شدہ صورت حال پر بات کرتے ہیں۔1947ء سے لے کر تا حال دونوں ملکوں کے درمیان حالات کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوئے۔اتنا لمبا عرصہ گذرنے کے باوجود دونوں ملک کبھی بھی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ اس کے عوض ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگے ہوئے ہیں۔تضاد و فساد ختم نہیں ہوئے،اتحاد و اعتماد دونوں آپس میں روٹھے رہے۔راوی اگنی شیکھر سے پوچھتا ہے کیا تم ان دونوں ملکوں کے بیچ اختلاف اور بکھراؤ کی وجہ بتا سکتے ہو؟ تو اگنی شیکھر اپنا ردعمل کچھ یوں ظاہر کرتا ہے کہ میرے خیال سے یہ سارا فساد پھولوں والے باغ یعنی وادی کشمیر کا ہے۔جو طاقت کے زور پر تقسیم ہوا اور دونوں فرقوں کی خواہشیں کہ یہ باغ ہمیں ملے۔راوی کہتا ہے کہ تمہاری بات میں واقعی دم ہے لیکن دونوں کو کون سمجھائے،انہیں پیار و محبت

اوراچھائی کی باتیں کون بتلائے اورکون ان کو یہ بتائے کہ دونوں ملکوں کی تہذیب وثقافت اور ہر چیز دونوں ملکوں کی سانجھی ہے۔

**افسانہ ''بھوک کو بھوجن کیا''** خالد حسین کا ایک بہترین افسانہ ہے ۔جس میں جنس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں گلابوں کی بیٹی لاجو کی کہانی بیان کی گئی ہے۔لاجو جنس زدہ ہونے کی وجہ سے کئی مردوں سے اپنی جنسی بھوک مٹانے میں ناکام رہتی ہے اور بالآخر فلم اکٹرس بننے چلی جاتی ہے۔

**افسانہ ''حلالہ''** میں بھی خالد حسین نے جنس جیسے نازک موضوع کو بڑے سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ یہ کہانی نہایت دلچسپ اورمتاثر کن ہے اس کہانی میں افسانہ نگار نے راجاں جیسی خوبصورت عورت کی جنسی بھوک اورنواب علی خان جیسے مرد کی باہمی کشمکش اورحلالہ جیسی شرعی مسئلے کوموضوع بنایا ہے۔

**افسانہ ''دردِ چھوڑے کا حال''** ایک دردناک کہانی ہے ۔جس میں دھرم اورسیاست کی آڑ میں ہندوستان اور پاکستان میں بے گناہوں پر گولہ باری کوموضوع بنایا گیا ہے ۔اس کہانی میں سرحد کے آر پار رہنے والے لوگوں کی بدنصیبی کا حال بیان ہوا ہے جوسرحد کے دونوں اطراف فوج کی گولیاں کھا کھا کر آئے دن ہلاک ہوتے ہیں اس کہانی کا کردار سلوتری گاؤں کا رہنے والا قاسم منہاس سرحد پار سے ہونے والی فائرنگ سے موقع پر ہی دم توڑ دیتا ہے تو سرحد کی دونوں طرف یعنی ''تیتری نوٹ'' اور ''سلوتری'' میں اس کی نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے ۔ایک طرف اصلیت میں تو اور دوسری طرف غائبانہ۔ کیوں کہ قاسم منہاس کا بھائی تیتری نوٹ گاؤں میں ہجرت کر گیا ہے جوسلوتری گاؤں کے بالکل سامنے ہے۔ میت کو دفنانے کے بعد مولوی دعائے مغفرت پڑھتا ہے ۔امن وسکون کے لیے دعائیں مانگتا ہے لیکن دعائیں ہوا، پانی اورمٹی میں تحلیل ہورہی ہیں کہ جن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ اسی احساس کواس کہانی کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔

**کہانی ''سانجھا دور''** میں کشمیری پنڈتوں کا اپنے وطن سے بچھڑنے اورملی ٹینسی کے زخم خردہ دلوں کی بھڑاس کوموضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کہانی جموں اور دیگر علاقوں میں آبسے کشمیری پنڈت مہاجروں اوران کے تئیں کشمیری مسلمانوں کی قرابت داری اوراٹوٹ وابستگی کی دلالت کرتی ہے۔ جہاں ان مہاجرین کے بعض لیڈر

کشمیری مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہیں وہی جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دم شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔لہذا اس کہانی کے مرکزی کردار پنڈت گاش لال کول جب کشمیری مسلمانوں کے خلاف دھواں دھار تقریر کرنے کے بعد جموں کے رگھوناتھ بازار میں ایک عمر رسیدہ کشمیری مسلمان کو دیکھتا ہے جو فرن پہنے، سر پر پگڑی اور کاندھے پر پشمینے کا شال آویزاں کیے چل رہا تھا تو وہ لاشعوری طور اس شخص کی طرف لپکا اور بے ساختہ بغل گیر ہوتا ہے حالانکہ وہ اسے نہیں جانتا۔ یہ منظر کشمیری تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔

**افسانہ ''عروج وزوال کا المیہ''** میں چودھری جگت سنگھ اور اس کے اکلوتے بیٹے لاڑی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ بیٹا بہت زیادہ خراب ہے اور برے کاموں کی تمام حدیں پار کرتا ہے اور قتل کیس میں جیل چلا جاتا ہے۔اس کا باپ اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن کوئی بھی حربہ کارگر ثابت نہیں ہوتا اس لئے وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اس طرح خالد حسین نے بڑے ہی دلچسپ اور عبرت آمیز الفاظ میں ایک بدترین صورت حال کو کہانی کا روپ دیا ہے۔

**افسانہ ''پس دیوار''** میں ایک بوڑھے فن کار کا بدترین کردار اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ مس نازیہ نام کی لڑکی سے اپنے بیٹے ہندال حیدر کی شادی کراتا ہے جب اس کا بیٹا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ چلا جاتا ہے تو بوڑھا فن کار سسر ہونے کی حیثیت سے اپنی بہو کی عزت وعصمت لوٹتا ہے۔

**افسانہ ''بے گونج صدائیں''** ایک ایسی کہانی ہے جو انتہائی دلچسپ، سبق آموز اور مختصر لفظوں میں بہت کچھ کہہ جانے والی کہانی ہے۔اس کہانی میں بے بے نوراں، جو ایک معمر خاتون ہے، کی سادگی، مخلصانہ جذبے اور اس کے اندر چھپی فرشتہ صفت عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔مجموعی طور پر مذکورہ کہانی ہندوستانی سرکار کے فوجیوں اور ملی ٹینٹوں کی باہمی رقابت کو عیاں کرتی ہے۔یہ کہانی ایک آرمی میجر اور ایک خاتون کی باہمی بات چیت پر مشتمل ہے۔ جسے افسانہ نگار نے افسانوی رنگ میں برتا ہے۔

**افسانہ ''گھر کی جنت''** دراصل خالد حسین کی پہلی کہانی ہے جو 1969ء میں سرکاری اخبار ''دیہات سدھار'' میں چھپی تھی۔اس کہانی میں خالد حسین نے کالج کی ایک طالبہ علم شہناز سے عثمان کے محبت

کے قصے کو بیان کیا ہے۔عثمان شادی شدہ ہے لیکن شہناز اسے بے حد چاہتی ہے۔محبت اور فرض کے متضاد جذبے سے مغلوب ہوکر عثمان بالآخر اپنی محبوبہ شہناز کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کے بجائے اپنی بیوی فردوس کے ساتھ سفر حیات طے کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔

**افسانہ ''کھنڈر ضمیر''** ایک مختصر سی کہانی ہے۔جس میں بڑے اختصار کے ساتھ بہت بڑے مسئلے یعنی آدمی اور انسان کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے۔پولیس اور ملی ٹینٹوں کے ساتھ تصادم میں پولیس ایس۔پی۔او کی پرموشن۔یہ تمام باتیں آدمی کے قتل وخون سے تعلق رکھتی ہیں۔مذکورہ کہانی میں ایس۔پی۔او اقبال کو اس لئے ترجیح نہیں دی جاتی ہے کیوں کہ اس نے کوئی جنگجو نہیں مارا تھا۔مطلب یہ کہ کوئی پولیس کا ملازم چاہے کتنا ہی اچھا کارکن کیوں نہ ہو تب تک ترقی کا کوئی زینہ نہیں چڑھ سکتا جب تک وہ کسی انسان کا سر کاٹ کر اپنے آفیسر کے سامنے نہ رکھ دے۔اس کہانی میں ایس۔پی۔او اقبال کو محض اپنی پرموشن کے لئے اپنے آفیسر کو اپنے بیگ میں سے کسی آدمی کا سر نکال کر ثبوت کے طور پر دکھانا ایک لرزہ خیز عمل ہے اس طرح اس کہانی میں انسان کی وحشیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔حرص ولالچ کی بنیاد پر ایک انسان دوسرے انسان کا قتل کس طرح کرتا ہے۔اس بات کو موضوع بنا کر خالد حسین نے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے۔

**افسانہ ''روپ اور سائے''** ایک الم ناک کہانی ہے جس میں راجو نام کی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔راجو جو کہ ایک معصوم اور افلاس زدہ لڑکی ہے کی پامالی کا حال پڑھ کر آنکھیں نم ہونے لگتی ہیں۔اس کہانی میں ایک شہری بابو راجو کی عزت وعصمت لوٹتا ہے اور پھر وہ حاملہ ہوکر ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے۔شہری بابو شہر چلا جاتا ہے اور راجو مجذوبانہ زندگی گذارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔پھر کہانی کار یا راوی اس پر ترس کھا کر اس کے ساتھ شادی رچوا کر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ہمارے سماج میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مشکل میں پھنسے ہوئے لاچاروں کی دستگیری کرتے ہیں۔

**افسانہ ''کنوار گندل''** ایک ایسی کہانی ہے جس میں خالد حسین نے حالات کے جبر میں گلاں نام کی بیوہ کی بے بسی اور اس کے جیٹھ جاجی کا اس کے ساتھ نکاح کرنے کی خواہش کو بیان کیا ہے تو وہیں جبر

ااور فیضاں جیسے کردار جنسی نفسیات کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔ مذکورہ افسانہ اپنے عنوان ہی کے لحاظ سے کافی معنی خیز اور قابل غور ہے۔

**افسانہ ''بیڈے کی لنکا''** زمانہ، ماضی اور حال کی کئی ذہنی الجھنوں، یادوں اور برائی کی دلدل میں پھنسے لوگوں کی کہانی ہے۔ بیڈے کی اپنی لنکا ہے جس سے وہ بے پناہ پیار کرتا ہے۔ شراب اور جوئے کے علاوہ وہ اپنے گردونواح کے اس تمام ماحول کا نمائندہ ہے جو برائی سے تعلق رکھتا ہے۔

**افسانہ ''کھوکھلا سورج''** میں افسانہ نگار کا فنی شعور معراج کمال کو پہنچتا ہے۔ ہماری آج کی عدالتیں ان پرانی عدالتوں کی طرح نہیں ہیں جن میں جج صاحبان عدل وانصاف کرنا جزوایمان خیال کرتے تھے۔ زیرنظر افسانہ میں مریم جیسی دوشیزہ کی عزت وعصمت آفتاب عالم جیسا بدمعاش لوٹتا ہے۔ تمام گواہوں اور شہادتوں کے باوجود محض چند سرکردہ لوگوں کے دباؤ میں آکر جج فاروق ملزم آفتاب کو باعزت بری کردیتا ہے۔ اس افسانے میں حضرت عمرؓ کے عدل وانصاف کے حوالے سے بھی کہانی کے اختتامی حصے میں قاری کو یہ باور کرایا گیا ہے کہ آج کی عدالتوں میں جج صاحبان جو کہ عدل وانصاف اور قانون کے رکھوالے ہیں، رشوت اور سفارش کے چکر میں کس طرح سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ قرار دیتے ہیں۔

**افسانہ ''میری چادر میرے پیر''** نہایت دلچسپ، معلوماتی اور تفکر وتدبر کی حامل کہانی ہے۔ ایک ادیب کہ جس کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ اُس کی کتابیں، اُس کی نگارشات ہوتی ہیں۔ بیوی بچوں کے مطالبات یا یوں کہیے کہ خرچے زیادہ آمدنی کم میں وہ کتنی ذہنی کوفتوں سے گذرتا ہے۔ یہ تمام باتیں اس کہانی میں بیان کی گئی ہے۔ زیرنظر کہانی کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ اس کا موضوع اپنے اندر آفاقیت رکھتا ہے۔ جذبات واحساسات، امنگوں، آرزوؤں اور سنہرے سپنوں سے اس کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔

**افسانہ ''اشتہاروں والی حویلی''** خالد حسین کی ایک نمائندہ کہانی ہے۔ جس میں مستری اکرام کھوکھر کی حویلی جو کسی زمانے میں اپنی پوری شان وشوکت اور دلکشی کے لئے مشہور تھی مگر نااہل اولاد کے باعث یہ حویلی عیاشیوں کا مرکز بن کر رہ گئی۔ اکرام کھوکھر کا بڑا بیٹا اسلام کھوکھر شرابی بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اہل وعیال

کے لئے باعث اذیت بن جاتا ہے جبکہ اکرام کھوکھر کا دوسرا بیٹا انعام کھوکھر کی لڑکی حسنہ کھوکھر طوائف بن جاتی ہے۔اس طرح خالد حسین نے اپنی اس کہانی میں عروج وزوال کے اسباب کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔

## پلاٹ:

افسانے میں پلاٹ کی حیثیت جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے ۔تمام تر کہانی اس پر منحصر کرتی ہے۔وقار عظیم کے مطابق پلاٹ واقعات یا تاثرات کو ایک فنی ترتیب دیتا ہے ۔اسی فنی ترتیب میں قصہ کی ابتدا اور انجام کے درمیان ایک منطقی ربط کا خیال رکھا جاتا ہے تاکہ قصہ میں ''وحدت تاثر'' قائم رہے۔ پلاٹ کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں ۔مثلاً سادہ پلاٹ، پیچیدہ پلاٹ ۔غیر منظّم پلاٹ اور ضمنی پلاٹ وغیرہ۔ایک ناقد کے مطابق سادہ پلاٹ میں واقعات ایک تسلسل سے بیان کئے جاتے ہیں اور ابتدا سے اختتام تک بتدریج چڑھتے اور اترتے چلے جاتے ہیں ۔درمیان میں پستی یا بلندی آتی ہے ۔ایسی کہانیاں بہ آسانی قاری کی سمجھ میں آجاتی ہیں ۔بیشتر افسانوں کے پلاٹ پیچیدہ ہوتے ہیں ۔ان میں واقعات باہم دگر نہایت پیچیدگی کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں ۔یعنی کسی افسانے کی ابتدا ہی میں مبہم انجام پیش کر دیا جاتا ہے ۔افسانے کے باقی حصہ میں اسی راز کو افشا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں پلاٹ کو الجھا دیا جاتا ہے اور آخر میں جا کر یہ راز افشا ہوتا ہے۔قاری کا تجسس آخر وقت تک قائم رہتا ہے ۔ایسے افسانے دلچسپ اور حیرت انگیز ہوتے ہیں ۔بعض افسانوں کے پلاٹ غیر منظّم ہوتے ہیں ۔ایسے پلاٹ میں کئی واقعات مجموعی طور پر پیش کیے جاتے ہیں ،جن میں ایک مرکزی شخص محور کا کام دیتا ہے ۔ایسے افسانوں میں اکثر قاری کو واقعات کا بیان بے ترتیب نظر آتا ہے ۔لیکن یہ ایک فنی بے ترتیبی ہوتی ہے ۔فنکار بہت غور وفکر اور محنت کے بعد واقعات میں یہ بے ساختگی پیدا کر پاتا ہے ۔جو ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ۔کچھ پلاٹ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے واقعات منفرد ہوتے ہوئے بھی قصے کو منتہا تک پہنچانے میں مدد دیتے ہیں ۔اکثر طویل کہانیوں میں مرکزی

پلاٹ کے علاوہ ضمنی پلاٹ بھی ہوتے ہیں۔ کچھ افسانے سادہ اور پیچیدہ دونوں پلاٹوں میں مشتمل ہوتے ہیں۔

ایک کامیات افسانہ نگار پلاٹ کی تعمیر میں بہت محنت کرتا ہے۔ وہ کہانی کے آغاز اور انجام پر پوری نگاہ رکھتا ہے اور اس سلسلے میں وہ کردار اور موضوع پر پوری توجہ دیتا ہے۔

خالد حسین کے افسانوں میں منظّم، مربوط اور سادہ پلاٹ پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی کہانی بے ربط معلوم ہوتی ہے لیکن مجموعی طور پر کہانیوں میں ربط و تسلسل شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔

**افسانہ ''ستی سر کا سورج''** کا پلاٹ سادہ اور منظّم ہے۔ اس کہانی میں واقعات ایک تسلسل سے بیان کیے گئے ہیں اور ابتدا سے اختتام تک بتدریج چڑھتے اور اترتے چلے جاتے ہیں کہیں بھی جھول اور بے ترتیبی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ کہانی میں مرکزی کردار نندرشی (شیخ نورالدین ولی علیہ الرحمۃ) کو ستی سر کا سورج کہا گیا ہے۔ نندرشی سلر سین کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو وہ ماں کا دودھ پینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُسی وقت ایک روحانی ماں اور معروف کشمیری شاعرہ لل عارفہ وہاں سے گذرتی ہیں اور وہ انہیں اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ نندرشی دنیا کی تمام قیمتی چیزوں کو چھوڑ کر محبت، طریقت اور اخوت کا درس دینے لگتے ہیں، اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس کا نام نور تھا۔ وہ محبت اور معرفت کی چٹائی پر بیٹھ کر لوگوں کے دِلوں کو اپنی نوری کرنوں سے روشنی بخشتا تھا۔ اُس کی محبتی آنکھ عیب نہیں دیکھتی تھی۔ وہ محبت کا نوری کلمہ پڑھتا رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ رَب ہی ساری خلقت کا خالق و مالک ہے''۔4

نو ر کی ان سب باتوں کا علم جب اس دور کے حاکم کو ہوتا ہے تو وہ بہت دکھی اور پریشان ہو جاتا ہے۔ دشمنی اور حسد کی آگ اور زیادہ بھڑک جاتی ہے۔ حاکم فریب اور مکاری سے حکومت کرتا ہے نور تو کہتا ہے کہ حاکم لوگوں کے دلوں پر حکومت کرے نہ کہ ان کے جسموں پر، لہذا وہ نور کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ حاکم اپنی آپ بیتی کے اہم کردار ''میں'' کو اپنے ساتھ ملاتا ہے اور ایک بڑا لشکر تیار کرتا ہے اس

کے بعد بڑی زوردار جنگ ہوتی ہے۔ جنگ میں حاکم کی شکست اورنور کی جیت ہوتی ہے۔لیکن حاکم ہارنہیں مانتے ہیں اوروہ نئی نئی چالیں چلنی شروع کردیتے ہیں۔ وہ ملاؤں اوردھرم ماتماؤں کو اپنے ساتھ ملاتا ہے اوردوبارہ جنگ لڑتا ہے۔اس بار حاکم جیت جاتا ہے۔محبت، یکتا،امن،شانتی،معرفت اورروحانیت سب ہار جاتے ہیں اور پھرلوگ غنڈوں اور بدمعاشوں کی حکومت دیکھتے ہیں لوگ مذہبی جنون اورانتہاپسندی کے غلام بن جاتے ہیں۔ وہ مصیبت اور پریشانی کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں اور پھراس کہانی میں آگے بتایا گیا ہے کہ جب اس دھرتی یعنی ''ستی سر'' پر حد سے زیادہ گناہ بڑھ جاتے ہیں تو ستی سر کا سورج یعنی نندرشی کی روح کو بھی وہاں سکون نہیں ملتا اورکس طرح سے ان کی روح وہاں سے بھاگ جاتی ہے اور پھرکس طرح لوگ یکجا ہوکر نندرشی کو ڈھونڈنے لگتے ہیں تاکہ ظلم وستم کے خلاف لڑائی لڑی جائے۔''میں'' کا سرکاٹ دیا جائے اورستی سرکو آزاد کرایا جائے۔ پھرنندرشی کو حمزہ مخدوم اوران کی بہن چکریشوری کے علاوہ نندرشی کے چار دوست منانے اوردوبارہ ستی سر میں واپس لانے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ پھر یہ لوگ ساری کہانی چندر بھاگا کے صوفی سنتوں کو سناتے ہیں۔صوفی سنت انہیں بتاتے ہیں کہ وہ یعنی نندرشی اوران کی ماں یہاں کیسے آسکتے ہیں ان کے پاس تو ستی سر کی بادشاہی ہے۔ یہ لوگ واپس جاتے ہیں اورمرگن کے میدان میں دیکھتے ہیں کہ ایک خلقت کھڑی تھی اوران کے بیچ نندرشی روحانیت کا پرچم لئے عوام سے خطاب کررہے تھے۔اس طرح کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔

**افسانہ'' لکیر''** کا پلاٹ مجموعی طور پر مربوط ومنظّم ہے۔واقعات میں ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔اس کہانی میں بھوٹ بھائیان کے سجاول چودھری اورصابری،حسب ونسب،جبروقید اوردہشت ووحشت سے بھاگ کرراجوری میں پیار کے ستونوں پر ایثار کی چھت ڈال کرمحبت کا ایک آشیانہ بنالیتے ہیں۔وقت گذرتا ہے۔آنگن میں سانول اورنفیسہ پروان چڑھ رہے ہیں۔سجاول اپنی محنت سے ترقی کررہا ہے لیکن اسی دوران صابری اپنے والد چودھری سراج دین کی وفات کی خبرسن کرچاچا سرداراُتم سنگھ کے ساتھ اپنی ماں سے ملنے کی غرض سے بھوٹ بھائیاں جاتی ہے، یہ وعدہ کرکے کہ وہ جلد ہی واپس آجائے گی لیکن صابری کے جانے

کے کچھ دنوں بعد ہی ملک تقسیم ہو جاتا ہے۔ کُشت وخون کی آندھی چلتی ہے۔ قبائلی حملہ ہوتا ہے۔ بھارتی فوجیں ریاست میں داخل ہوتی ہیں، قبائلیوں کو ریاست سے کھدیڑنے کے لئے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بھارت کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر بھی تقسیم ہو جاتی ہے۔ صابری بھوٹ بھائیاں (پاکستان) میں رہ جاتی ہے۔ اور اس کا سجاول راجوری (ہندوستان) میں۔ سجاول پوتے پوتیوں والا ہو جاتا ہے، لیکن اسے پتہ نہیں ہوتا ہے کہ اس کی صابری کہاں ہے۔ زندہ ہے یا مرگئی ہے۔ سجاول چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار صابری کو دیکھ لے۔ سجاول افسانہ کے راوی خالد حسین سے صابری کی کھوج خبر کی التجا کرتا ہے۔ راوی کو سرینگر سے مظفر آباد جانے والی پہلی بس سے پاکستان جانا ہوتا ہے۔ راوی سجاول کی درد بھری کہانی سن کر جذباتی ہو جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ ''ملک کی تقسیم کی وجہ سے لاکھوں خاندان اُجڑے، لاکھوں موت کا نوالہ بنے''۔ وہ من ہی من میں سیاست دانوں اور مذہبی جنونیون کو کوستا رہتا ہے لیکن راوی سجاول سے کیا ہوا وعدہ نبھاتا ہے۔ بھوٹ بھائیاں جا کر صابری سے ملتا ہے اور اُسے اُس کے سجاول، سانول اور نفیسہ کے بارے میں سب کچھ بتاتا ہے۔ صابری روتے بلکتے سب کچھ سنتی ہے اور پھر صابری اماں اپنی دُکھ بھری کہانی سناتی ہے کہ تقسیم کے دنوں میں کس طرح انسان ہندو اور مسلمان کے نام پر مارے جا رہے تھے لیکن کشمیر کی مشترکہ تہذیب کے پروردہ چاچا سردار اُتم سنگھ کو سجاول سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ سردار چاچا اِسی دنگے فساد کے ماحول میں صابری کو سجاول کے گھر پہنچانے کے ارادے سے نکلتا ہے۔ جب وہ مدار پور کے راستے بلنوئی پہنچتے ہیں۔ وہاں رات گذارتے ہیں، دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے نکل پڑتے ہیں۔ ابھی مینڈھر کے نزدیک سخی میدان ہی پہنچتے ہیں کہ پٹھان بلوائی انہیں گھیر لیتے ہیں۔ ایک بلوائی جب اماں صابری کی طرف بڑھنے لگتا ہے تو چاچے اُتم سنگھ انہیں للکارتے ہیں اور وہ تلوار نکال لیتا ہے۔ مگر بلوائیوں کے پاس بندوقیں ہوتی ہیں۔ چاچے بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں لیکن تلوار بندوق کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ چاچا اُتم سنگھ صابری اماں کی لاج بچاتے بچاتے اور اپنا وچن نبھاتے نبھاتے شہید ہو جاتا ہے۔

مشترکہ تہذیب کے پیکر خالد حسین اماں صابری کے راجوری آنے کا بندوبست کرواتا اور آخر کار اماں

صابری ''چکاں دے باغ'' والے راستے سے اپنے سجاول اور اپنے بچوں سانول اور نفیسہ کے پاس پہنچ جاتی ہے۔اسے اپنے ہی وطن میں اجنبی کی طرح صرف ایک ماہ رہنے کی اجازت ملتی ہے جو پلک جھپکتے ہی گذر جاتا ہے۔اماں صابری کو راجوری میں مستقل رہائش کی اجازت نہیں ملتی ہے۔آخر کار اماں صابری کو پاکستان جانے کے لئے نکلنا پڑتا ہے۔''چکاں دے باغ'' کی ہند پاک سرحد پر ''نو مین لینڈ'' کی مقام پر پہنچ کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں اور وہ گر پڑتی ہیں۔اس کو اٹھانے کے لئے دونوں ملکوں کے سرحدی محافظ دوڑتے ہیں پر جب وہ اماں صابری کے پاس پہنچتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ اماں صابری کی روح جسم کا پنجر چھوڑ چکی ہوتی ہے اور سارے قاعدے، قانون اور ضابطوں سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔

**افسانہ ''پریم کھیلن کا چاؤ''** کا پلاٹ بھی سیدھا سادہ ہے۔کہانی میں روانی ہے۔تسلسل کہیں ٹوٹتا نہیں ہے اور قاری کو الجھن کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔اس کہانی میں ہمایوں محنتی انسان ہوتا ہے جس نے اپنی محنت اور لگن کے ساتھ سماج میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہوتا ہے۔وہ اپنی اولاد کو ناز وادا کے ساتھ پالتا ہے اور انہیں وہ سب کچھ دیتا ہے جو ایک والد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔یہاں تک کہ ان کی شادیاں بھی اپنے خرچے سے کرواتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہمایوں نے بھی اپنے بھائیوں، دوستوں اور قرابت داروں کے ہاتھوں گہرے زخم کھائے مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ محنت اور مشقت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔دن رات کام کیا، دولت کمائی، جائداد بنائی اور سماج میں اپنی دستار کو ستکار دلایا۔اس نے اپنی اولاد کو نازوں سے پالا۔انہیں وہ سب کچھ دیا جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ان کی شادیاں دھوم دھام سے کرائیں اور عالیشان کوٹھیاں بنا کر دیں، تاکہ وہ اپنی زندگی خود جی سکیں۔''5

غرض ہمایوں انہیں سب کچھ مہیا کرتا ہے یہاں تک کہ کوٹھیاں بھی بنا کر دیتا ہے۔لیکن اس کے نکمے بیٹے اس کے کندھوں پر چڑھ کر دھاڑتے رہتے ہیں۔ایک طرف جہاں ہمایوں کا کردار اولاد کو سب کچھ مہیا

کرتا ہے وہیں دوسری طرف اس کو اولاد کی طرف سے ایک ذرا سا سُکھ بھی نہیں ملتا ہے بلکہ اُلٹا اس سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر ہمایوں اپنی بچی ہوئی زندگی کو اب ضائع نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ فقیری کا چولا پہن لیتا ہے اور عشقِ حقیقی کی جستجو میں نکل پڑتا ہے۔ کیوں کہ یہی ایک چیز ہے جو انسان کو سکون بخشتی ہے۔ اس طرح کہانی میں روانی ہے اور واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

**افسانہ ''ایک مرے بندے کی کہانی''** کا پلاٹ بھی سادہ سلیس اور رواں ہے۔ ایک کڑی کے ساتھ دوسری کڑی جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہیں بھی پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا اور کہانی بہ آسانی قاری کو سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس کہانی میں ایک مرا ہوا بندہ جس کا نام منظور تھا اپنی کہانی خود سناتا ہے۔ منظور گھر سے 3 کلومیٹر دور پن چکی چلاتا ہے۔ ایک دن بھاری برف باری ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ پن چکی میں ہی رات گذارنے کا فیصلہ کرتا ہے، رات کے کوئی گیارہ بجے کچھ ملی ٹینٹ اس کے پاس آکر ٹھہرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں اور نکل پڑتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں پولیس اسے بار بار حراست میں لے جاتی ہے اور اس کی گھریلو حالت ابتر ہو جاتی ہے۔ آخر کار منظور تنگ آکر ملی ٹینٹوں کے ساتھ جا ملتا ہے وہاں کسی معصوم آدمی کا خون نہ کرنے کے جرم میں ملی ٹینٹ اسے گولی مار کر ہلاک کر دیتے ہیں اور اس کی لاش کو برف کے نیچے دفنایا جاتا ہے۔ جب اس کے قاتل کو پولیس گرفتار کر لیتی ہے تو وہ اس کی لاش کو نشاندہی کر کے باہر نکلواتا ہے۔ منظور کے جنازے میں منگل چاچا وغیرہ وہ سارے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کو اس کے کمانڈر نے ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس طرح اس کہانی میں واقعات کا آپس میں ربط و تسلسل ہے۔

**افسانہ ''آدمی کے اندر چھپا آدمی''** کا پلاٹ بھی سادہ، منظّم اور مربوط ہے۔ واقعات کو ترتیب وار بیان کیا گیا ہے کہیں بھی جھول اور پیچیدگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اس کہانی میں ضمیر احمد ایک جذباتی انسان ہیں جو بدروا کا رہنے والا ہے وہ ہر وقت ملک میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو اچھالتا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت ہندو مسلم کی ڈفلی بجاتا رہتا ہے۔ فرقہ وارانہ آگ بھڑکانے میں ضمیر احمد پیش پیش

رہتا ہے۔پیش ہے ایک اقتباس:

''جناب !دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہوگیا۔ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے ۔ہماری حالت شوردوں سے بھی بدتر ہوگئی ۔ہماری پہچان ملک دُشمن،غدار،جنونی،اور دہشت گرد بنادی گئی ہے''۔6

ضمیر احمد ہر وقت ملی ٹینٹوں کی حمایت کرتا رہتا ہے ۔اوران کے کارنامے بڑے فخریہ انداز میں سناتا رہتا ہے۔ایک دفعہ پاڈر جو ضلع کشتواڈ کا ایک بلاک ہے ضمیر احمد، ڈاکٹر الطاف اورارحم چودھری کے ساتھ سرکاری کام سے جاتا ہے وہاں سے واپسی پر راستے میں ان کا سامنا دہشت گردوں سے ہوتا ہے جوان سب لوگوں کی تلاشی اور چھان بین کرتے ہیں اور مسلمان ہونے کی وجہ سے باقی سب کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن ڈرائیور تیج رام کو پکڑ لیتے ہیں اوراسے مارنے کی تیاری کی جاتی ہے۔موت کو سامنے دیکھ کر تیج رام گڑگڑانے لگتا ہے اورمنت سماجت کرتا ہے کہ میری پانچ بیٹیاں ہیں ان کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں اوراس کے بغیران کا کوئی سہار انہیں ہے۔اس پر ترس کھائے لیکن تیج رام کی منت سماجت سے ملی ٹینٹوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا اوروہ اسے مارنے کی تیاری کرنے لگتے ہیں۔دریں اثنا ضمیر احمد بیچ میں آجاتا ہے اورانہیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہے کہ کہتا ہے کہ تم ایسا نہیں کرسکتے ،اس غریب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، کمزور کو مارنا کس مذہب میں لکھا ہے یہ ساری باتیں سن کر ضمیر احمد کے ساتھی حیران ہوجاتے ہیں کہ کیا یہ وہی ضمیر احمد ہے جو یہ کہا کرتا تھا کہ''یہ لوگ ہماری ہی دیگ میں ہمارے ہی لہو سے ہمارا ہی گوشت ابالتے ہیں،اورکتوں کو کھلاتے ہیں''۔

ضمیر احمد کی باتیں سن کر ملی ٹینٹ تیج رام کو چھوڑ دیتے ہیں اور تیج رام بہت خوش ہوتا ہے اورکہانی اختتام کو پہنچتی ہے،اس طرح اس کہانی کا پلاٹ سادہ،منظّم اورمربوط ہے واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

**افسانہ'' دیوار پر لکھے حروف''** کا پلاٹ بھی مربوط ومنظّم ہے ۔اس مختصرسی کہانی میں باہمی بات چیت میں راوی اگنی شیکھر سے پوچھتا ہے کہ کیا تم بتاسکتے ہو کہ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ اختلاف

اور بکھراؤ کی کیا وجہ ہے تو اگنی شیکھر اپنا ردعمل کچھ یوں ظاہر کرتا ہے کہ میرے خیال سے یہ سارا فساد پھولوں والے باغ یعنی کشمیر کا ہے جو طاقت کے بل پر تقسیم ہوا ہے اور دونوں فرقوں کی خواہشیں کہ یہ باغ ہمیں ملے۔راوی کہتا ہے کہ تمہاری بات میں دم ہے لیکن دونوں کو کون سمجھائے ،انہیں محبت، پیار اور اچھائی کی باتیں کون بتلائے اور انہیں کون بتائے کہ دونوں ملکوں کی تہذیب وثقافت ایک دوسرے کی سانجھی ہے۔اس طرح کہانی بھرپور تاثر کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

**افسانہ ''بھوک کو بھوجن کیا''** کا پلاٹ بھی سادہ، مربوط اور منظّم ہے، واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔اس کہانی میں لاجو گلابی کی اکلوتی بیٹی ہے۔شوہر کی وفات کے بعد گلابو اپنی بیٹی لاجو کو کبھی بھی یتیم ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتی ہے وہ حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور بڑے لاڈ پیار سے اپنی بیٹی کو پالتی ہے۔گلابی ایک کمبل بننے کے کارخانے میں مزدوری کر کے گذارا چلاتی ہے اور اپنی بیٹی کی پرورش کرتی ہے لیکن بیٹی ماں کے گھر آنے تک گاؤں کے مشٹنڈوں سے موج مستی کرتی رہتی ہے اس موج مستی کے چکر میں وہ تین مرتبہ گھر سے بھاگ بھی جاتی ہے۔آخری بار اسے کالیا پہلوان کے ساتھ دہلی سے پکڑ کر واپس لایا جاتا ہے جب لاجو کے گھر واپس آنے کی خبر چودھری رحیم بخش کو ہوتی ہے تو وہ اپنے بیٹے کریمے کا رشتہ مانگنے کے لیے گلابو کے گھر جاتا ہے، رشتہ طے ہوتا ہے اور شادی بھی ہو جاتی ہے لیکن شادی کے کچھ دنوں بعد ہی لاجو کریمے سے اکتا جاتی ہے اس طرح راجو جنس زدہ ہونے کی وجہ سے کئی مردوں سے جنسی بھوک مٹانے میں ناکام رہتی ہے اور بالآخر فلم اکٹر بننے چلی جاتی ہے اس طرح کہانی اختتام کو پہنچتی ہے۔

خالد حسین کے دیگر افسانوں میں جن میں حلالہ، درد و چھوڑے کا حال، سانجھا دور، پس دیوار، بے گونج صدائیں ،گھر کی جنت ،جمہوریت ،کھنڈر ضمیر ،روپ اور سائے ،اشتہاروں والی حویلی، کنوار گندل، بیڑے کی لنکا، کا پلاٹ بھی موثر اور جاندار ہے۔واقعات ایک تسلسل سے بیان کیے گئے اور ابتدا سے اختتام تک بتدریج چڑھتے اور اترتے چلے جاتے ہیں۔غرض خالد حسین نے اپنے افسانوں میں واقعات کی فنی ترتیب و تنظیم کا خاص خیال رکھا ہے۔ترتیب وار واقعات بڑے دلچسپ موثر پیرائے میں اس

طرح بیان کیا ہے کہ افسانے میں ابتدا سے اختتام تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور کہانی بہ آسانی قاری کی سمجھ میں آجاتی ہے۔

## کردار نگاری:

پلاٹ کی ہی طرح افسانے میں کردار نگاری کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔گو بغیر کردار کے بھی افسانے لکھے گئے ہیں مگر ایسے افسانے جن میں کسی کردار کو موضوع یا محور بنایا گیا ہوتا دیر قاری کے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں جیسے منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ'، پریم چند کا 'کفن'، کرشن چندر کا 'کالو بھنگی' وغیرہ۔کردار جتنا فعال اور جاندار ہوگا افسانہ اسی قدر توانا ہوگا۔افسانے میں چونکہ مختصر وقت اور الفاظ میں کردار کے تاثر کو پوری طرح ابھارنا مقصور ہوتا ہے اس لئے افسانہ نگار کو زیادہ احتیاط اور فنی باریکیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر وقار عظیم کے مطابق:

> ''افسانہ کے پلاٹ اس کی ترتیب اور اس کی تحریک کو جتنا ضروری بتایا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری خود افسانوی کردار ہے (یعنی افسانے کے کردار) اس لئے افسانوی فن کو تحریک میں لانے کے لئے ہمیں کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے''۔7

افسانہ میں کردار دو طرح کے ہوتے ہیں ایک مرکزی کردار اور دوسرا ضمنی کردار۔عام طور پر کہانی یا قصہ مرکزی کردار کے ہی گرد گھومتا ہے۔ضمنی کرداروں کو افسانہ نگار وقتی طور موقع و محل کے اعتبار سے پیش کرتا ہے جو قصے کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں لیکن قصہ یا کہانی میں مرکزی کردار کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ کہانی اسی مرکزی کردار کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔

جہاں تک خالد حسین کی کردار نگاری کا تعلق ہے ان کے کردار ہماری زندگی، ہمارے معاشرے اور ہماری معاشرتی کردار ہیں۔افسانہ پڑھتے وقت کبھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔وہ ہم کو اپنے آس پاس

اورقرب وجوار ہی میں دکھائی دیتے ہیں ۔ان کے کردار'' کوئی تصویرلگادے کسی دیوار کے ساتھ'' کی طرح نہیں ہیں ۔ بلکہ سانس لیتے ، جیتے جاگتے اور ہمارے ہم دوش وہم قدم کردارنظرآتے ہیں ۔ پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

''خالد حسین اپنے افسانوی کرداروواقعات گڑھتے نہیں بلکہ اپنے سامنے اورآس پاس کی زندگی اورزمین سے منتخب کرتے ہیں یہ کردار ان سے وابستہ واقعات تصوراتی نہیں حقیقی ہیں جنہیں خالد حسین ایک ذراسا تخلیقی ٹچ (Touch) دے کرفطری رنگ وروپ میں قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں''۔8

خالد حسین نے اپنے افسانوی کرداروں کو نہایت دلچسپ اور پرکشش انداز میں پیش کیا ہے۔مثلاً افسانہ''ستی سر کا سورج''میں افسانہ نگار نے نندرشی، للیش وری، سلرسین، کشپ پیر، اورحضرت حمزہ مخدوم جیسے کرداروں کو پیش کر کے ستی سر کی زمیں پر ہورہے فسادات کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔نندرشی اس کہانی کا کردار ہے وہ دنیا کی تمام قیمتی چیزوں کو چھوڑ کر محبت ،طریقت اوراخوت کا پیغام دیتا ہے۔اس میں محبت اورانسانیت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔وہ لوگوں کو روحانی تعلیمات اورانسان دوستی کا درس دیتا ہے۔اس شخصیت کا تعارف افسانہ نگاراس طرح کرواتے ہیں:

''اس کا نام نور تھا۔وہ محبت اورمعرفت کی چٹائی پر بیٹھ کرلوگوں کے دلوں کواپنی نوری کرنوں سے روشنی بخشتا تھا۔اس کی محبتی آنکھ عیب نہیں دیکھتی تھی ۔وہ محبت کا نوری کلمہ پڑھتا رہتا اورلوگوں سے کہتا ہے کہ رب ہی ساری خلقت کا خالق ومالک ہے''۔9

نندرشی انا کے شکار حاکم کو درس دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں پرحکومت کرے نہ کہ ان کے جسموں پر۔لوگوں کا دل پیارومحبت سے جیتے نہ کہ ظلم سے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''نور کہتا تھا کہ حاکم لوگوں کے دلوں پرحکومت کرے، ان کے جسموں پرنہیں۔وہ

حاکم کو درس دیتا کہ انسان کا شکار احسان سے کرے۔ پیار اور محبت سے ان کا دل جیتے ظلم سے نہیں۔ کیوں کہ ظلم ایک بیماری ہے اور رحم اس کی دوا ہے۔ نورا سے نصیحت کرتا کہ وہ اپنی آتم کتھا میں سے ''مَیں'' کا شبد باہر نکال دے ورنہ حسد اور نفرت کی آگ میں جل کر ختم ہو جاؤ گے۔ وہ کہتا کہ یہ ''مَیں'' تباہی اور بربادی لاتی ہے۔ شکر کی طرح میٹھی زندگی میں زہر گھول دیتی ہے''10؎

نندرشی کی یہ ساری باتیں اس وقت کے حاکم کو کانٹے کی طرح چبھتی تھی جو فریب اور مکاری سے حکومت کرتا تھا لہذا حاکم نور کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ بڑی زوردار جنگ ہوتی ہے نور بڑی بہادری اور دلیری کے ساتھ حاکم کا مقابلہ کرتا ہے جنگ میں حاکم کو شکست اور نور کی جیت ہوتی ہے۔ اس طرح نندرشی ستی سر کے لوگوں پر ہو رہے بے جا ظلم وستم اور زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ رکھتا ہے افسانے کے آخر میں نندرشی ستی سر کو جنون، نفرت اور گھمنڈ کی لعنت سے آزاد کرانے کی خواہش رکھتا ہے تا کہ اپنی تہذیب وثقافت کو زندہ رکھا جائے۔

**افسانہ ''لکیر''** کے کرداروں میں سجاول چودھری، صابری اور سردار اُتم سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ خالد حسین نے یہ افسانہ تقسیم ملک کے پس منظر میں لکھا ہے۔ سجاول چودھری اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ اس میں سجاول اور صابری کے جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں ہجرت در ہجرت جو دوریاں پیدا ہوتی ہیں وہ تمام صورت حال قاری کو آنسو بہانے پر مجبور کرتے ہیں یعنی دونقوش ملن اور جدائی کے درد وکرب سے گذرنے کے بعد زندگی کے کس موڑ پر دم توڑ دیتے ہیں وہ تمام مایوس کن حالات محض تقسیم ہند کے باعث وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ سجاول چودھری جو اب اسّی برس کا ہو چکا ہے، صابری سے بے انتہا محبت کرتا ہے لیکن تقسیم ہند کی وجہ سے ان کے تعلقات میں دراڑیں پیدا ہوتی ہیں۔ سجاول راجوری (ہندوستان) میں رہ جاتا ہے اور اس کی صابری بھوٹ بھائیاں (پاکستان) میں۔ سجاول صابری سے جدا ہونے کے باوجود بھی اس سے والہانہ محبت رکھتا ہے جس کا اظہار وہ راوی کے سامنے ان الفاظ میں کرتا ہے:

''بیٹا! میں نے تم کو دو تین بار ٹیلی ویژن چینلوں پر دیکھا ہے۔ مجھے معلوم پڑا ہے کہ تم کشمیر کے دوسرے حصے میں جا رہے ہو جہاں میری صابری رہتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر جانے کیوں مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ تم میرا کام ضرور کرو گے اور مجھے مایوس نہیں کرو گے''۔11

اماں صابری کا کردار بھی نہایت اہم ہے وہ بھی سجاول سے دور ہونے کے باوجود بھی بے حد محبت کرتی ہے اور اس سے ملنے کی خواہش رکھتی ہے وہ راوی سے کہتی ہے کہ:

''پر بیٹا! میرے ہاتھوں پر جدائی کی مہندی بڑی گہری ہے۔ یہ ابھی تک پھیکی نہیں پڑی اور سجاول میری حقیقت ہے، میری محبت، میری عبادت، میرے دل نے سدا اس کے نام کا ہی وِرد کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اس لئے میری مدد کر میں سجاول سے ملنا چاہتی ہوں۔ سانول اور نفیسہ کو ملنا چاہتی ہوں۔ بیٹا! حیاتی کچے گڑھے کی طرح بڑی بے اعتباری ہوتی ہے اس لئے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے سے پہلے مجھے راجوری لے چلو''۔12

اماں صابری کو اپنے ہی وطن میں اجنبی کی طرح صرف ایک ماہ رہنے کی اجازت ملتی ہے جو پلک جھپکتے ہی گذرتا ہے اسے راجوری میں مستقل رہائش کی اجازت نہیں ملتی آخر کار اماں صابری کو پاکستان جانے کے لئے نکلنا پڑتا ہے وہ ''چکاں دے باغ'' کی ہند پاک سرحد پر ''نو مین لینڈ'' کے مقام پر پہنچ کر اپنی جان دے دیتی ہے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اماں صابری کو خواہش تھی کہ وہ زندگی کی آخری گھڑیاں سجاول اور بچوں کے ساتھ گذارے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آدھے راستے میں پہنچ کر اماں صابری رک گئی شاید ستانے کے لئے۔ وہ نو مین لینڈ کی دونوں جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں کبھی سجاول کو دیکھتیں تو کبھی اپنے بچوں کو۔ وہ دوبارہ چلنے لگی لیکن دو چار

قدم چلتے ہی اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ گر پڑی۔اس کو اُٹھانے کے لئے دونوں ملکوں کے سرحدی محافظ دوڑے پر جب وہ اماں صابری کے پاس پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اماں صابری کی روح جسم کا پنجر چھوڑ چکی تھی اور سارے قاعدے، قانون اور ضابطوں سے آزاد ہو چکی تھی''۔13

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اماں صابری کا حب الوطنی کا جذبہ اور اس کا درد ناک انجام قاری کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا کرتا ہے وہ مرتے مرتے یہ احساس دلاتی ہے کہ حب الوطنی کا جذبہ کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکتا، کہانی پڑھنے کے بعد قاری کو اماں صابری اور سجاول دونوں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔خالد حسین نے اماں صابری کے کرداروں کے وسیلے سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ فساد کی وجہ سے بٹوارہ نہ صرف زمینوں کا ہوتا ہے بلکہ اس زمین پر رہنے والے ہزاروں انسان کا ہوتا ہے، ان کے دلوں کا ہوتا ہے یہ تقسیم انسان کے تعلقات میں دراڑیں پیدا کر دیتی ہیں۔

**افسانہ ''پریم کھیلن کا چاؤ''** کا مرکزی کردار مرزا ہمایوں بیگ ہے۔پوری کہانی اس کے گرد گھومتی ہے اور یہ کردار آغاز سے انجام تک فعال اور متحرک نظر آتا ہے۔جس کے بیٹے اس کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں۔ہمایوں ایک محنتی انسان ہوتا ہے جو اپنی محنت، مشقت اور لگن سے سماج میں ایک اہم مقام حاصل کرتا ہے وہ بڑے لاڈ پیار سے اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے اور انہیں وہ سب کچھ دیتا ہے جو ایک والد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ان کی شادیاں بھی اپنے خرچے سے کرواتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمایوں نے بھی اپنے بھائیوں، دوستوں اور قرابت داروں کے ہاتھوں گہرے زخم کھائے مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ محنت اور مشقت کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔دن رات کام کیا، دولت کمائی، جائداد بنائی اور سماج میں اپنی دستار کو ستکار دلایا۔اس نے اپنی اولاد کو نازوں سے پالا۔انہیں وہ سب کچھ دیا جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ان کی شادیاں دھوم دھام سے کرائیں

اور عالیشان کوٹھیاں بنا کر دیں، تا کہ وہ اپنی زندگی خود جی سکیں۔''14؎

ایک طرف ہمایوں کا کردار اولاد کو سب کچھ مہیا کرتا ہے یہاں تک عالیشان کوٹھیاں بھی بنا کر دیتا ہے وہیں دوسری طرف اس کو اولاد کی جانب سے ایک ذرا سا سکھ بھی نہیں ملتا بلکہ الٹا اسے پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے نکمے بیٹے اس کے کندھوں پر چڑھ کر دھاڑتے رہتے ہیں اور اپنے باپ کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں۔ وہ غرور اور گھمنڈ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہمایوں بیگ کے بیٹوں کے کردار کے تعلق سے خالد حسین لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے بے حیائی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ ان کو محنت اور ایمانداری کی روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہٹ دھرمی، غرور اور گھمنڈ کا شکار تھے۔ ان کے سلوک میں سلیقے اور حلیمی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ بدکلامی کرتے۔ رشتے داروں اور ہمسائیوں کے ساتھ ایسی زبان میں بات کرتے کہ لفظوں کی پنکھڑیاں بھی زخمی ہو جاتیں۔ وہ بات بات پر دُشنام طرازی پر اُتر آتے اور قانون کی گردن دبوچ لیتے۔ وہ دونوں عقل کے بھوکے تھے کیوں کہ عقل ذات رب کی یہ وارث نہیں سب کی''۔15؎

خالد حسین نے مرزا ہمایوں بیگ اور اس کے بیٹوں کے کردار کے وسیلے سے انسانی رشتوں کی ناپائیداری کے احساس کو اجاگر کیا ہے اور ہمارے سماج میں درپیش مختلف پہلوؤں کو منظر عام پر لایا ہے۔

''افسانہ ایک مرے بندے کی کہانی'' کا مرکزی کردار منظور ہے۔ پوری کہانی اس کے گرد گھومتی ہے۔ منظور کا کردار ایک ایسے بے بس اور مجبور آدمی کا کردار ہے جو پولیس اور فوجوں کی تشدد کا نشانہ بنتا ہے اور پھر تنگ آ کر ملی ٹینٹوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے، منظور جان بوجھ کر دہشت گرد نہیں بنتا ہے بلکہ وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ ملی ٹینٹوں کو جگہ دینے اور کھانا کھلوانے کے جرم میں پولیس اسے بار بار پکڑ کر لے جاتی ہے اور اسے مار پیٹ کرتی ہے، وہ اپنے افراد خاندان کے ساتھ بے انتہا محبت اور لگاؤ رکھتے ہیں اسے اپنے

گھر والوں کی پریشانی اور دکھ درد نہیں دیکھی جاتی ہے اس لئے وہ تنگ آ کر ملی ٹینٹوں کے ساتھ جا ملتا ہے، ایک اقتباس دیکھئے:

''میں اپنی مرضی سے ملی ٹینٹ نہیں بنا تھا۔مَیں تو سرکاری آتنک واد کا شکار تھا۔یہی وجہ تھی کہ مَیں ان کے ساتھ رہ کر بھی اُداس رہتا۔گُم سُم، خاموش۔مجھے اُنکے رنگ ڈھنگ اچھے نہیں لگتے تھے۔نفرت اور جنون نے اُن کی عقل گِروی رکھ لی تھی۔وہ مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کرتے تھے اور یوں مذہب کی توہین کرتے تھے۔گھٹیا رہن سہن، لاعلمی اور کم عقلی نفسیاتی بیماریاں ہوتی ہیں اور یہ بیماریاں اِن بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں بھی تھیں۔آتنک واد بڑا ظالم ہوتا ہے۔چاہے یہ سرکاری ہو، چاہے دہشت گردوں کی طرف سے ہو۔یہ امن کو یرغمال بناتا ہے اور اِنصاف کو یتیم۔مَیں بھی یتیم بن گیا تھا اور میرے بیوی بچے بھی''۔16؎

منظور ایک ایسے آدمی کا کردار ہے جس میں نیکی، محبت، شفقت اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔وہ دہشت گردوں کے ساتھ رہ کر بھی دہشت گردوں سے نفرت کرتا ہے کیوں کہ اسے اُن کے کارنامے اچھے نہیں لگتے ہیں۔منظور ایک ایسا ملی ٹینٹ ہے جو انسانیت کا قتل کبھی ہونے نہیں دیتا ہے ایک مرتبہ اس کا کمانڈر اسے کسی معصوم آدمی کا قتل کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ ہمت جٹا نہیں پاتا ہے اور ایسا کرنے سے صاف انکار کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ایک معصوم آدمی کا قتل کرنا ساری انسانیت کے قتل کے برابر ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک دن امیر نے مجھے ڈُوڈُو کے نمبردار ٹھاکر منگل سنگھ اور اس کے بیٹے کو قتل کرنے کا حُکم دیا اور کہا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے اور اس کی مُخبری کی وجہ سے اس کا بھائی فاروق انصاری اپنے تین ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔میں ٹھاکر منگل سنگھ کو

اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہمارے گاؤں کا سب سے عمدہ شخص تھا۔ ہندو مسلم بھائی
چارے کا علمبردار، غریب پرور، مظلوموں کے حق کے لئے لڑنے والا فرشتہ انسان
اور میرے ابو کا بچپن کا دوست ۔ لہذا میں یہ ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا کہ
چاچا منگل سنگھ مُخبری کر سکتا ہے ۔ وہ ایک سچا انسان تھا اور گاؤں کی شان ۔ مَیں
نے اِس مشن پر جانے سے صاف انکار کر دیا''۔17ء

بالآخر وہ دہشت گردوں کی نافرمانی کی وجہ سے ہی دہشت گردوں کی گولی کا شکار بن جاتا ہے ۔ اس کہانی میں خالد حسین نے منظور کا کردار پیش کر کے یہ واضح کرنے کی سعی کی ہے کہ سرکاری دہشت گردی ہی دراصل غیر سرکاری دہشت گردی کو جنم دیتی ہے ۔

''افسانہ آدمی کے اندر چھپا آدمی'' کا مرکزی کردار ضمیر احمد ہے اس کے علاوہ ارحم چودھری، ڈاکٹر الطاف اور تیج رام اس کہانی کے ضمنی کردار ہیں ۔ پوری کہانی مرکزی کردار ضمیر احمد کے گرد گھومتی ہے ۔ ضمیر احمد ایک حساس مسلمان ہے وہ ہندو دشمن نہیں لیکن بڑھتے ہوئے ''ہُندوتواواد'' کا مخالف اور سیاسی وسماجی نابرابری اور جانبداری کی سرکاری پشت پناہی سے بیزار بھی ہے ۔ اِسی طرح وہ کٹر وادی مولویت کے بھی خلاف ہے ۔ ضمیر احمد کو راوی سمجھا تا ہے کہ'' تنگ نظری'' انتہا پسندی اور جنونیت دونوں طرف ہے ۔ سبھی ایک جیسے نہیں ہوتے ۔ آدمی آدمی میں انتر ہوتا ہے''۔

ضمیر احمد ملک کی تقسیم کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ہلاکت خیز مانتا ہے کیوں کہ تقسیم ملک کے بعد مسلمان تیسرے درجے کا شہری بن کر رہ گیا ہے ۔ اس کے ذہن میں آزادی کے دنوں کے فسادات اور اس کے بعد کے حالات بھی ہیں لیکن ضمیر احمد کا ضمیر بیدار بھی ہے ، روشن خیال بھی اور انسان دوست بھی ۔ وہ کہتا ہے:

''جناب! دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ ہم تیسرے درجے کے
شہری بن گئے ۔ ہماری حالت شودروں سے بھی بدتر ہو گئی ۔ ہماری پہچان ملک

دُشمن ،غدار،جنونی،اوردہشت گرد بنادی گئی ہے۔ہمیں ہرمیدان میں
پچھاڑ دیا گیا ہے ۔ہم غُر بت اور مسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں ۔ہم لاچار
ہو چکے ہیں''۔18؎

ضمیر احمد کا کردار ایک جذباتی کردار ہے جو اپنے طبقہ کیساتھ ہورہی بے انصافیوں کے لیے حکومت اور اکثریتی طبقے کو ذمہ دار گردانتا ہے اور اس کے خلاف بولتا رہتا ہے لیکن جب ملی ٹینٹ اس کے ڈرائیور تیج رام کو مارنے لگتے ہیں تو وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر ملی ٹینٹوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ڈرائیور تیج رام کو ان کے نرغے سے چھڑانے کے لئے دلیری اور بے خوفی سے بولتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمیں ایسی ازادی کی ضرورت نہیں جس میں دوسرے مذاہب اور عقیدے کے
ماننے والوں کو اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق نہ ہو۔ہم بھیڑیوں کے جنگل میں
نہیں رہتے ہم انسان ہیں اور انسانیت کے اصولوں کے مطابق زندگی جینا چاہتے
ہیں ۔ہم خدا سے ڈرنے والے لوگ ہیں ،تم بھی اللہ سے ڈرو۔موت
ہندو یا مسلمان نہیں دیکھتی ۔اللہ کا فرمان ہے کہ زمین پر رہنے والی مخلوق پر رحم
کرو''۔19؎

اس طرح ضمیر احمد کا کردار سماج کے اس طبقہ کی نمائندگی کرتا ہے جو ہوش کھو کر جوش میں باتیں کرتا ہے لیکن جوں ہی جوش اور ہوش ٹھکانے لگتے ہیں تو اس بات کا اعادہ کرتا ہے کہ انسان کو انسان سے دوستی کرنی چاہئے۔

تیج رام اس کہانی کا نمائندہ کردار ہے جس کا قصور یہ ہے کہ وہ پیدائشی طور پر ہندو ہے۔جب ملی ٹینٹ اسے قتل کرنے لگتے ہیں تو وہ ایک معصوم فطرت کا انسان واقع ہوتا ہے اور بڑی معصومیت سے منت سماجت کرنے لگتا ہے۔اسے اپنی بیٹیوں کی بڑی فکر ہونے لگتی ہے۔پیش ہے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''سرکار مجھے نہ مارو،میری جان بخشی کردو۔میری پانچ بیٹیاں ہیں۔ان کے ہاتھ

پیلے کرنے ہیں ۔ان کی پڑھائی ،شادی ،مجھ پر بڑی ذمہ داریاں ہیں اورمَیں کمانے والا اکیلا ہوں ۔اس لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے چھوڑ دو۔حضور میرا گھر برباد ہوجائے گا ۔میری بچیاں دردر کی ٹھوکریں کھانے مجبور ہوجائیں گی ۔ان کا کوئی وسیلہ نہیں ہے ۔وہ بھیک مانگنے لگیں گی ۔مجھ پر ترس کھائیں۔ پرماتما۔۔۔نہیں نہیں اللہ آپ کا بھلا کرے گا''۔20؎

**افسانہ'' بھوک کو بھوجن کیا''** کا مرکزی کردار لاجو ہے ۔اس کے علاوہ گلابو، چودھری رحیم بخش ،گاماں ،سرنے بابو،کریما،اختری بائی ،کالیا پہلوان وغیرہ ضمنی مگر اہم کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں ۔لاجو کے گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔خالد حسین اس کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ایک تو بالی عمر دوسرا کوئی روکنے والا بھی نہیں ۔سانولے رنگ کی سانولی لاجو،آنکھیں جیسے مست شرابی اورانگ انگ میں جوبن کی ترنگ ۔اس کی شوخ طبیعت کی شوخیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں اوروہ اپنے وجود کی آگ کو سر پر اُٹھائے بھاگنے لگی''۔21؎

لاجو ایک بدطینت اور بداخلاق لڑکی کا کردار ہے ۔وہ جنسی بے راہ روی کا شکار ہونے کی وجہ سے کئی مردوں سے اپنی جنسی بھوک مٹانے میں ناکام رہتی ہے،وہ گاؤں کے مشٹنڈوں سے ہمیشہ آنکھیں لڑاتی رہتی ہیں اوران کے ساتھ موج مستی کرتی رہتی ہیں وہ اپنی ماں کی عزت وآبرو کا خیال نہ رکھتے ہوئے تین مرتبہ اپنے گھر سے بھاگ بھی جاتی ہے،اقتباس ملاحظہ ہو:

''لاجو پہلی بار کلونتے چودھری کے بیٹے بنتے کے ساتھ بھاگی جواُسے امرتسر میں امرت پلانے کے بعد ساتویں دِن گھر لے آیا ۔دوسری بار وہ گاؤں کے کمپاؤنڈر سرنے بابو کے ساتھ چلی گئی ۔وہ اُسے کشپ رشی کی وادی میں سیر کرانے لے گیا تھا اوراب تیسری بار وہ دلی سے پکڑی گئی تھی ۔دلی اُسے کالیا

پہلوان لے گیا تھا''۔22؎

لاجو جنس زدہ ہونے کے باوجود بھی انتقام لینا جانتی ہے۔مثلاً ایک مرتبہ جب چودھری لاجو کو جے درزی کے لڑکے برکت کے ساتھ آنکھ لڑاتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ لاجو کو بے عزت اور مار پیٹ کر کے گھر سے نکال دیتا ہے چند دنوں بعد جب چودھری لاجو کو لینے آتا ہے تو لاجو بھی چودھری کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتی ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''لاجو جے درزی کے لڑکے برکت کے ساتھ آنکھیں لڑانے لگی۔ایک دِن چودھری کی نظر پڑی تو اس نے لاجو کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔لاجو نے اس کی غیرت اور عزت کو للکارا تھا۔لاجو جس گھر کی مٹی تھی وہیں جا پہنچی۔تھوڑے دنوں بعد جب چودھری کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ لاجو کو لینے آیا۔لاجو نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور چودھری کو اسی طرح بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا جس طرح اُسے نکالا گیا تھا''۔23؎

کہانی کا دوسرا اہم کردار لاجو کی ماں گلابو ہے۔گلابو ایک محنتی عورت ہے جو اپنی محنت اور مشقت سے اپنا گذارا چلاتی ہے۔اور بڑے لاڈ پیار سے اپنی بیٹی کی پرورش کرتی ہے۔شوہر کی وفات کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری گلابو پر آن پڑتی ہے، وہ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتی ہے، کسی کا احسان نہیں لیتی ہے بلکہ ایک کارخانے میں مزدوری کر کے اپنی بیٹی کو پال پوس کر بڑا کرتی ہے وہ اپنی بیٹی کو کبھی بھی یتیم ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتی ہے، ایک اقتباس دیکھئے جس میں گلابو کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے:

''گامے کے مرنے بعد گلابو نے لاجو کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ یتیم ہوگئی ہے۔اُس نے حالات کا مقابلہ مردانہ وار کیا اور بڑے لاڈ پیار سے لاجو کو پالا۔بھلا گائے کو کبھی اپنے سینگ بھی بھاری لگے اور پھر کہتے ہیں نا کہ ''باپ گھوڑی پر چڑھا کھوٹا اور ماں بھیک مانگتی اچھی۔'' پر گلابو نے کبھی بھیک نہیں

مانگی۔وہ سارا سارا دِن کلونتے چودھری کے کمبل بُننے کے کارخانے میں کر گی

چلاتی''۔24ے

گلابو ایک شرمیلی اورعزت دارعورت کا کردار ہے۔وہ اپنی بیٹی کی کرتوتوں سے بڑی نادم اور شرم سار رہتی ہے۔جب چودھری گلابو کے گھر اپنے بیٹے کا رشتہ مانگنے آتا ہے تو گلابو اپنی لاج کو قائم رکھنے اور بیٹی کا کردار سنوارنے کے لئے ہاں کر دیتی ہے۔

غرض خالد حسین کے افسانوں میں جتنے بھی کردار ہیں سب اپنی اپنی جگہ اہم اور سرگرم ہیں ان کے ہر افسانہ کا ایک ایک کردار جیتا جاگتا اور متحرک نظر آتا ہے۔وہ منٹو کی طرح اپنے کرداروں کو حقیقی روپ میں پیش کرنے کے قائل ہیں۔ان کے کردار شیطان یا فرشتے نہیں ہوتے بلکہ گوشت پوشت کے انسان ہوتے ہیں جو اپنی تمام تر برائیوں اور خوبیوں کے ساتھ قاری کے سامنے آتے ہیں۔اور اس بات سے بےخبر ہیں کہ ان سے نفرت کی جائے گی یا محبت۔ان کی یہی سادگی،ان کی اصلیت انہیں انسان دوست اور ہمدردی کا مستحق بنا دیتی ہے اور قاری کی تمام تر ہمدردیاں اور نیک خواہشات ان کرداروں کے ساتھ ہوتی ہے۔یہیں پر خالد حسین کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

## مکالمہ نگاری

افسانے کے عناصر ترکیبی میں مکالمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔مکالمے کرداروں کو نمایاں کرنے میں بے حد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔مکالموں ہی کے ذریعہ افسانے میں کرداروں کی سماجی حیثیت،مقام و مرتبہ،ان کے عیب و ہنر،ان کی اچھائیاں اور برائیاں،ان کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیت عیاں ہوتی ہیں۔افسانہ میں مکالمہ نگاری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سنبل نگار لکھتے ہیں:

> مکالمے کے سلسلے میں دو باتیں ضروری ہیں ایک تو یہ کہ مکالمے غیر ضروری طور پر
> طویل نہ ہوں کہ قاری انہیں پڑھنے میں اکتا جائے۔دوسری بات اس سے بھی

زیادہ ضروری ہے وہ یہ کہ مکالمے ایسے ہوں جیسے پڑھے لکھے آدمی کے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ مکالمے کردار کی ذہنی کیفیت کے آئینہ دار ہوں مثلاً کوئی شخص غصے کے عالم میں گفتگو کرتا ہے تو اس کا انداز بیاں کچھ اور ہوتا ہے ،خوشی کے حالت کچھ اور۔ کامیاب فن کار مکالمے لکھتے وقت ان باتوں کو دھیان میں رکھتا ہے''۔25

خالد حسین نے اپنے افسانوں میں مکالمہ نگاری سے خوب خوب کام لیا ہے۔ وہ کرداروں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں ۔انہوں نے اپنے افسانوں میں مکالموں کے ذریعے کرداروں کے احساسات وجذبات اوران کے خیالات کی بھرپور عکاسی کی ہے ۔انہوں نے اپنی کہانیوں میں مکالموں کو موقع ومحل کی مناسبت سے برتا ہے مثلاً افسانہ' حلالہ' میں جب نواب کو اپنی بیوی راجاں کی جواد کے ساتھ موج مستی کے بارے میں پتہ چلتا ہے تو وہ راجاں سے پوچھنے لگتا ہے۔

''مَیں کیا سُن رہا ہوں ۔تو جواد کے ساتھ ۔۔۔تمہیں شرم آنی چاہیئے ۔وہ تیرا دیور ہے، تیرے بیٹے جیسا۔''

''یہ بکواس ہے ۔تم مجھ پر بہتان لگا رہے ہو۔تمہیں کوئی حق نہیں مجھے اس طرح ذلیل کرنے کا ۔میں اپنے ماں باپ کی لاج رکھتے ہوئے تیرے جیسے ڈھیلے ڈھگے کے ساتھ گذارا کر رہی ہوں ۔پھر بھی تم مجھ پر شک کر رہے ہو''۔راجاں گرجی۔

''ہاں ہاں تم اب عربی گھوڑے پر سواری کر رہی ہو نا اس لیے اب مجھے ڈھیلا ڈھگا کہہ رہی ہے پر میری ایک بات سن لے جس دن میں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اُسی دن تجھے طلاق دے دوں گا اور چونڈا پکڑ کر حویلی سے باہر نکال دوں گا۔پھر ٹھٹھیروں کے چوبارے پر بیٹھی کبوتر اُڑاتی رہنا۔''نواب غصے میں اُبل

رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے، کتے بھونکیں تو چاند کو کیا۔''26؎

اس مکالمہ سے میاں بیوی کے جذبات واحساسات اور نفسیاتی کیفیات کے علاوہ ان کے تعلقات کی بھی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ کرداروں کی مناسبت سے مکالمے ادا کروایے گئے ہیں۔

خالد حسین نے اپنے بیشتر افسانوں میں طویل مکالموں سے کام لیا ہے مثلاً اسی افسانے میں آگے جب نواب ایک روز جواد کو راجاں کی آغوش میں دیکھ کر پکڑ لیتا ہے تو وہ راجاں کو طلاق دیتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''طلاق۔۔طلاق۔۔طلاق۔۔۔۔''

جواد بھاگ گیا۔راجاں نے نواب کے پاؤں پکڑ لیے۔

''مجھے معاف کر دو۔میرا کوئی قصور نہیں ہے۔میرے ساتھ جواد نے زبردستی کی ہے۔۔۔'' وہ رونے لگی، چلّانے لگی لیکن یہاں اُس کا کوئی نہیں تھا۔نہ ماں، نہ بہن، پھر کون سُنتا بین۔

''چھنال تو میری عزت کی لُٹی ہوئی کمائی بن گئی ہے۔تیری بے حیائی نے حویلی کی غیرت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔اس حویلی میں مکھن کھاتے ہوئے تیرے دانت گھس گئے ہیں اس لیے تو یہاں سے دفع ہو جا نہیں تو مَیں تیرے دانت توڑ دوں گا۔

مَیں تجھے تین بار طلاق دے چکا ہوں اب تو میری منکوحہ نہیں ہے۔اب تو آزاد ہے۔اب جا اور سُوروں کو کھجور کُھلا۔۔۔''

''میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔مجھے معافی دے دو۔۔'' راجاں صفائی پیش کرنے لگی اندر سے وہ جانتی تھی کہ کنویں میں گری ہوئی اینٹ کبھی بھی خُشک

نہیں نکلتی۔

''چل چل ۔۔باہر کا راستہ لے،تُو تو کنجری ہے اور مکھی اور کنجری کبھی اندر نہیں رہتیں ۔تیری جیسی بدچلن بیوی شوہر کے لیے گالی ہے ۔۔۔۔۔'' وہ راجاں کو دھکے مارنے لگا اور بازو سے پکڑ کر باہر نکالنے لگا۔''27

اس مکالمہ سے جہاں میاں بیوی کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہوتی ہے وہیں کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کا سبب بھی ہے۔ جہاں اس مکالمے سے نواب کے جذبات کی شدت عیاں ہوتی ہے وہیں راجاں کی جنسی نفسیات اور بے بسی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔خالد حسین نے مذکورہ مکالموں میں عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے، جو سلیس اور سادہ ہے۔

طویل مکالمے کی ایک اور مثال افسانہ ''سانجھا دور'' سے دیکھئے جس میں ایک کشمیری پنڈت گاش لعل کول اور ایک کشمیری بزرگ خواجہ صاحب کی باہمی گفتگو سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ملی ٹینسی نے کشمیری پنڈتوں اور کشمیری مسلمانوں دونوں فرقوں کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''بندگی جناب ،بندگی ،خواجہ صاحب! کیا حال ہے آپ کا ؟ آپ ٹھیک ہیں۔آپ کے بچے راضی خوشی ہیں؟''

''نمسکار حضور !خُدا کا شکر ہے کہ ابھی تک زندہ ہیں اور راضی خوشی ہیں۔آپ بتائیں پنڈت جی ! یہاں سب کشل منگل ہے؟ آپ کی صحت ٹھیک ہے۔آپ کے بچے بھی راضی خوشی ہیں؟''

''ہاں خواجہ صاحب! بھگوتی کی کِرپا سے اور دستگیر صاحب کی دُعا سے ہم یہاں کُشل ہیں۔آپ بتائیں، وہاں کشمیر میں اب حالات قدرے سُدھرے ہیں یا مار کاٹ کا بازار ابھی بھی گرم ہے ۔اب تو وہاں کوئی مخبری نہیں کرتا ہوگا؟ اب تو وہاں کوئی غدار نہیں ہوگا؟ کیا آپ لوگ ہمیں یاد کرتے ہیں

؟'' گاش لعل کول خواجہ صاحب سے پوچھ رہا تھا۔

''ہم آپ کو ایک پل کے لئے بھی نہیں بھولے پنڈت جی۔ بھلا ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم تو صدیوں سے اکٹھے رہے ہیں۔ بھائیوں کی طرح۔ اپنوں کی طرح، پیار اور محبت کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ امن وامان سے زندگی گذاری ہے۔ ہمارا خون ایک ہے۔ ہماری نسل ایک ہے۔ ہماری زبان ایک ہے۔ ہمارا تمدن ایک ہے۔ تہذیب ایک ہے۔ ہمارے سنت فقیر اور رِشی سانجھے ہیں۔ ہمارے گیت سانجھے ہیں۔ ہمارے دُکھ اور خوشیاں سانجھی ہیں۔ ہم آپ کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم تو آپ کے بغیر ادھورے ہیں۔۔۔۔۔'' 28؎

اس مکالمہ سے کشمیری پنڈتوں اور کشمیری بزرگوں کی زبان اور خیالات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے جہاں اس مکالمہ سے پنڈت گاش لعل اور خواجہ صاحب کے جذبات واحساسات اور آپسی تعلقات کی ترجمانی ہوتی ہے وہی اس سے ان کی آپسی محبت اور شفقت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

**افسانہ ''گھر کی جنت''** سے ایک مکالمہ ملاحظہ کیجئے جس میں عاشق اور محبوبہ کے درمیان محبت اور ناراضگی کا پتہ چلتا ہے اس مکالمہ میں شہناز عثمان سے، جو کہ پہلے ہی سے شادی شدہ ہوتا ہے، اپنی محبت کا اظہار یوں کرتی ہے پیش ہے ایک اقتباس:

''عثمان مجھے تم سے محبت ہے۔ مَیں جانتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن دنیا والوں سے ڈرتے ہو کیوں کہ مَیں ایک امیر لڑکی ہوں اور تم غریب ہو''۔

''یہ ٹھیک ہے شہناز! لیکن تمہیں علم نہیں کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی ہے۔ مَیں تمہیں بہت پہلے بتا دینا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میری زبان کیوں نہ کھلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مَیں تمہیں چاہتا ہوں لیکن شہناز! مَیں

دوزندگیاں برباد نہیں کرسکتا۔اس لیے مجھے بھول جاؤ۔''

وہ غصے سے لال ہوگئی۔اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔وہ بولی:

''تم نے مجھے آج تک کیوں نہیں بتایا۔بدمعاش، کمینے۔اب مَیں تمہاری صورت کبھی نہیں دیکھوں گی۔''29؎

اس گفتگو سے جہاں شہناز اور عثمان کے محبت کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے وہیں شہناز کی ناراضگی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔مکالمہ برجستہ، سلیس اور رواں ہے۔

**افسانہ'' بے گونج صدائیں''** سے ایک مکالمہ ملاحظہ کیجئے جس میں میجر شرما، بوڑھی خاتون نوراں سے ملی ٹینٹوں کے بارے میں پوچھتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''مائی تم نے ان کو روٹی کیوں کھلائی ؟تم کو پتہ نیں کہ وہ ہمارے دُشمن ہیں۔وہ دُشمن مُلک سے ٹریننگ لے کر آتے ہیں اور یہاں تباہی مچاتے ہیں۔معصوم لوگوں کو مارتے ہیں اور تم لوگ اُن کو کھانا کھلاتے ہو۔اُن کو سونے کے لیے جگہ دیتے ہو۔یہ ایک سنگین جرم ہے۔اِس کی سزا موت بھی ہوسکتی ہے۔''

''میرے لعل! میرے جگر کے ٹکڑے! یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی میرے گھر بھوکا پیاسا آئے اور مَیں اُسے کھانا نہ کھلاؤں ۔یہ تو ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ہمارے رواج کے خلاف ہے۔ہم گاؤں والے گنوار پہاڑی لوگ مسافروں کو کھانا کھلانا، اِن کو رات گذارنے کے لیے جگہ دینا ثواب سمجھتے ہیں۔یہ رواج ہمارے یہاں صدیوں سے رائج ہے۔ہم نے اپنے پُرکھوں سے سیکھا ہے۔کیا تمہارے علاقے میں ایسا رواج نہیں ہے؟ کیا تم لوگ گھر آئے مسافروں کو بنا کھلائے پلائے نکال دیتے ہو۔۔۔اور یہ دُشمن کون ہے؟ ہمارا کوئی دشمن نہیں۔'' بے بے نوراں میجر شرما کو بتارہی تھی۔''30؎

اس مکالمے سے میجر شرما اور بوڑھی نوراں کے جذبات واحساسات اور کیفیات کی عکاسی ہوتی ہے۔اس مکالمہ سے جہاں میجر شرما کے جذبات کی شدت عیاں ہوتی ہے وہیں بوڑھی نوراں کی سادگی مخلصانہ جذبے اور ہمدردی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔مکالمہ کی زبان سلیس اور رواں ہے۔اس مکالمہ میں ایک بوڑھی پہاڑی عورت کی زبان اور خیالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ایک فوجی میجر کی زبان اور خیالات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غرض خالد حسین نے اپنی کہانیوں میں ایسے مکالمے پیش کیے ہیں جو انسانی جذبات واحساسات اوران کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں ان مکالموں سے جہاں کردار کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔وہیں یہ مکالمے کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کا سبب بھی ہے۔خالد حسین نے اپنے مکالموں میں عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے ان کے بعض مکالمے انتہائی دلچسپ اور معنی خیز ہوتے ہیں ،ان میں موزونیت ہے، ہر کردار اپنے مقام اور مرتبہ کے مطابق مکالمے ادا کرتا ہے۔

## منظر نگاری

منظر نگاری بھی افسانے کا ایک اہم پہلو ہوتا ہے۔کوئی بھی افسانہ خلا میں تخلیق نہیں پاتا بلکہ وہ ایک ماحول میں آگے بڑھتا ہے اور افسانہ نگار مختلف مقامات، واقعات اور مواقع کی منظر نگاری کرتے ہوئے اپنے افسانے میں رنگ بھرتا ہے۔کامیاب منظر نگاری وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سارا منظر جوں کا توں قاری کی نظروں کے سامنے گھوم جائے۔

منظر نگاری اور فطرت نگاری میں باریک سا فرق ہے۔منظر نگاری میں مکانوں کی بناوٹ، سجاوٹ ،شہروں، بازاروں، رہن سہن کے طریقے ،گلی کوچوں اور ضروریات زندگی کے سامانوں کا ذکر ملتا ہے جبکہ فطرت نگاری میں قدرتی مناظر جیسے پیڑ پودے، جنگل، پہاڑ، دریا، جھرنے وغیرہ کے مناظر شامل ہیں۔خالد حسین کے افسانوں میں منظر نگاری اور فطرت نگاری دونوں طرح کے نمونے ملتے ہیں مثلاً افسانہ ''پریم کھیلن

کا چاؤ'' میں خالد حسین نے بادشاہ ہمایوں کے مقبرے کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمایوں کے مقبرے کو دیکھ کر دل خوشی اور غمی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے ۔مُغل کاریگری کا ایک شاندار نمونہ۔اگر تاج محل کو غور سے دیکھو تو صاف لگتا ہے کہ اُس کا نقشہ ہمایوں کے مقبرے کے ساتھ بہت حد تک ملتا ہے ۔اس عظیم عمارت میں جہاں ایک جانب شہنشاہ ہمایوں اپنی قبر میں سویا پڑا ہے وہاں مقبرے کے چوگرد مُغل حکومت کے آخری شہزادے دفن ہیں۔جن کو انگریزوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا تھا اور دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت تاج محل کی داستان بھی ہمایوں کے مقبرے سے ملتی جلتی ہے۔''31؎

افسانہ ''ایک مرے بندے کہانی'' میں خالد حسین نے ایک کردار کے ذریعہ کشمیر کی برف باری کی بڑی عمدگی سے منظر کشی کی ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''اُس دِن بھاری برف پڑ رہی تھی ۔شام تک دو اڑھائی فُٹ برف جمع ہو چکی تھی۔سارا گاؤں برف کی چادر تلے دب چکا تھا۔ایسی حالت میں میرا گھر جانا بہت ہی مُشکل تھا کیوں کہ میری پن چکی (گھراٹ) سے میرے گھر کا فاصلہ تین کلومیٹر تھا اور برف پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔اس لیے مَیں نے پن چکی میں ہی رات گذارنے کا فیصلہ کیا۔مَیں نے آلو اور موٹھ پکائے اور مکئی کے آٹے کی روٹیاں بنائیں اور تمرو کی چٹنی کے ساتھ کھانا کھا کے سو گیا۔''32؎

اسی کہانی میں آگے جب منظور ملی ٹینٹوں کے گروہ میں شامل ہونے کی غرض سے گھر سے نکلتا ہے تو اس منظر کو خالد حسین نے منظور کے کردار کے ذریعہ یوں پیش کیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''رات کو جب سبھی سو گئے تو میں گھر سے نکلا اور سیوج دھار کی طرف چل پڑا اور سنگلاخ پہاڑی بگڈنڈی چڑھنے لگا۔دوسری صبح میں سیوج کے میدان میں تھا۔سیوج کے ایک طرف بھدرواہ اور چمبہ کے قصبے ہیں اور دوسری طرف ڈُوڈُو اور بنی کے علاقے یاترا آتی ہے۔ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ہزاروں شردھالو پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔سیوج جڑی بوٹیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔گرمیوں میں گوجر ،بکروال اور گدی اپنے گھوڑے ،گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں لے کر یہاں چراگاہوں میں آتے ہیں۔ان لوگوں نے یہاں عارضی ٹھکانے بنائے ہوتے ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں۔مَیں نے بھی ایک دن اور ایک رات ایک گدی کے ساتھ کچے کوٹھے میں گذاری۔''33؎

**افسانہ ''ستی سرکا سورج''** میں جب' ستی سر' کی دھرتی پر حد سے زیادہ گناہ بڑھ جاتے ہیں۔انسان،انسان کا قتلِ عام کرتا ہے تو ستی سرکا سورج یعنی نندرشی کی روح کو وہاں چین نہیں ملتا ہے اور نتیجتاً ان کی روح وہاں سے بھاگ جاتی ہے اس کی منظر کشی خالد حسین نے یوں کی ہے:

''پھر یوں ہوا کہ دو ہیولے مزار کے سیاہ دھوئیں سے باہر نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئے۔لوگوں کی آنکھیں اُن ہیولوں کو غائب ہوتے دیکھ کر پتھر ہوگئیں۔یہ منظر دیکھ کر سادھ سنتوں کی سمادھیاں چیخ اُٹھیں۔صوفی درویشوں کی قبریں کانپیں۔ایسے لگا جیسے نندرشی اپنی دودھ ماں کو ساتھ لے کر اِس ابھاگن دھرتی کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔شاید اپنے پُرکھوں کے دیش میں۔صوفی سنتوں کی دُنیا میں ہلچل مچ گئی۔''34؎

اس کہانی میں آگے جب رِشی منیوں اپنے مرشد نندرشی کو ڈھونڈنے کے لئے شاہ فریدالدین اور شاہ

اسرار کے پاس پہنچتے ہیں تو اس منظر کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے:

''آپ نندرشی کو نشاط کے ان پتھروں میں ڈھونڈو جہاں واسوگپت کو شیو فلسفے کا گیان ملا تھا۔کھیر بھوانی کے چناروں ،مارتنڈ کے مندروں ،شاردامٹھ اور مٹن بھون میں تلاشو۔ڈل،گنگ بل مانس بل ،وُلّر اور کوثر سر کے پانیوں میں ڈھونڈو۔ویری ناگ اور ناگ بل کے ناگوں سے دریافت کرو۔بُلبُل شاہ کی کمبلی اور شاہ ہمدان کے کلس میں دیکھو۔کھیت کھلیانوں اور کیسر کیاریوں میں جاؤ۔دِلوں کی دھڑکنوں اور سانسوں کی گرماہٹ میں محسوس کرو۔سیبوں اور باداموں کے باغوں میں جاؤ۔رنگ برنگے پھولوں کو سونگھو۔برف پوش چوٹیوں کی خوبصورتی میں تلاش کرو۔تمہارا مُرشد تمہیں ضرور ملے گا۔''35

**افسانہ ''حرص کا سفر''** میں خالد حسین نے ''مَیں'' کردار کے ذریعہ یہ دکھایا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے کیسے حرص کا شکار ہو جاتا ہے اور کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے،اس کی منظر کشی خالد حسین نے اس افسانہ میں یوں کی ہے:

''پھر مَیں نے ایک ایسی عمارت بنائی جو سورج سے چند قدم دُور تھی۔اُس بلڈنگ کو دُنیا کا نواں عجوبہ مان لیا گیا تھا۔خلقت میرے گُن گا رہی تھی۔اب خوش تھا اور مطمئن بھی۔میرے پاؤں دھرتی سے اوپر خلا میں اُڑ رہے تھے۔مَیں اُڑتا اُڑتا اُس عمارت کی چھت پر جا بیٹھا جو میں نے بنائی تھی اور دُنیا کو دیکھنے لگا پر دُنیا مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔خلقت کا کوئی وجود نہ تھا۔صرف میں تھا اور کوئی نہ تھا۔میرا چوگرد خالی تھا۔دھرتی کے ساتھ میرا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔میں نے زمین اُترنے کی لاکھ کوشش کی لیکن مجھے کوئی راستہ نہ ملا۔مَیں اُونچی عمارت کی چھت پر

اکیلا رہ گیا۔مَیں اپنے ہی کرموں کے فریب میں پھنس کر رہ گیا تھا۔وہ اُونچی آسمان کو چھوتی عمارت میرے لیے ایک کال کوٹھری بن گئی۔۔۔۔۔۔''36؎

اسی طرح خالد حسین نے افسانہ ''پس دیوار'' میں ایک منظر کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہر شخص دیواروں کا محتاج ہوتا ہے۔دیواریں ۔۔۔تعلقات کے بیچ کھڑی کرنے کے لئے۔کمپلیکس کے سرابوں میں حفاظت سے اُڑان بھرنے کے لئے۔دیواریں،مقصد پورا کرنے کے بعد مکارانہ فطرت کی تسکین کے لیے۔۔۔اور دیواریں۔۔۔۔۔بہار رُت کو گونگی اور اندھی خزاں سے بچانے کے لئے۔۔۔۔دیواریں شبنم کے قطروں کے بچاؤ کے کے، جو ہاتھ لگتے ہی اپنی دوشیزگی گنوا بیٹھتے ہیں۔''37؎

**افسانہ ''بیڈے کی لنکا''** میں خالد حسین نے بیڑے کی لنکا کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیڈے کی لنکا کھڑی ہے۔۔بڑے بڑے حادثوں،بھونچال اور طوفانوں کے باوجود بھی ۔یہ کوئی راون کی لنکا نہیں،جسے کوئی اجودھیا کا رام آ کے ڈھا جائے۔یہ تو بیڈے کی لنکا ہے۔دو کچے کمرے،ایک پکی بیٹھک اور تھوڑا سا آنگن اس لنکا کی کل کائنات ہے۔۔بیڈے کی لنکا میں آب وہوا سخت گرم اور سخت سرد ہی رہتی ہے۔یہ معتدل کبھی نہیں رہی۔یہ لنکا اس عظیم بستی میں کھڑی ہے جسے کبھی محلّہ استاد غوث محمد خاں کہتے تھے۔پر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس محلّہ کی ساری شان وشوکت،غیرت اور عزت کو مٹا کر رکھ دیا اور اس محلّہ کا نام سکڑ کر صرف اُستاد محلّہ رہ گیا۔''38؎

آگے اسی افسانے کا شام کا منظر پیش کرتے ہوئے سورج کے غروب کے منظر کو دیکھ کر بیڈا جس مایوسی کا شکار ہوتا ہے اس کی خوبصورت منظر کشی خالد حسین نے یوں کی ہے:

''شام کو کبھی کبھار بیڈا اپنی لنکا کی چھت پر بیٹھ کر دور سامنے سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہتا اور سوچتا۔''کاش سورج پھر اس طرف سے چڑھے اور دوڑتا دوڑتا اس کی گود میں آ کر بیٹھ جائے۔لیکن سورج مغرب سے کبھی نہیں ابھرا۔وہ تو ہمیشہ مشرق سے نکلتا ہے۔اور جب کبھی مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے الجھنے لگتے تو بیڈا مایوس ہو جاتا۔اس کا چہرہ بے رنگ ہو جاتا اور آنکھیں بے نور۔موت کی سی خاموشی اسے گھیر لیتی۔وہ جو کبھی مسجد میں نہیں گیا تھا۔روز مسجد میں جاتا۔نماز اسے آتی نہ تھی، پر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا اور نمازیوں کو سجدے کرتے ہوئے دیکھ کر دل ہی دل میں جانے کتنے سجدے کر ڈالتا۔پھر وہ اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیتا۔آسمان جو آگ برسا رہا ہوتا۔آسمان جس نے قیامت مچائی ہوتی اور جب کبھی پورب اور پچھّم آپس میں مل بیٹھنے کا فیصلہ کرتے تو بیڈے کے بے رنگ چہرے پر خوشیوں کے کئی رنگ چڑھنے لگتے۔آنکھوں میں ختم نہ ہونے والی آس کا نور پھر چمکنے لگا اور موت کی سی خاموشی زندگی کے مدھر سنگیت میں ڈھل جاتی۔''39

**افسانہ ''کھوکھلا سورج''** میں شہر کی مسجدوں ،مندروں کلیساؤں ،جھونپڑیوں ،حویلیوں وغیرہ کی منظر کشی کرتے ہوئے خالد حسین لکھتے ہیں:

''مسجدوں ،خانقاہوں ،مندروں ،گوردواروں اور کلیساؤں کے گنبد اور میناروں والا یہ شہر جس میں بستی شیخان کی جھونپڑیاں بھی ہیں۔خان بہادروں اور رائے

بہادروں کی حویلیاں بھی ہیں ۔اورایک پہاڑی کے دامن میں شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ میں کھڑا جج فاروق کا بنگلہ بھی ہے ۔بنگلہ کے لان میں کرسی پر بیٹھا جج۔۔مریم کے مقدمہ کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'' 40؎

**افسانہ''دیوار پر لکھے حروف''**،مَیں راوی اوراگنی شیکھر کی بھارت اور پاکستان کے بارے میں باہمی گفتگو میں بڑی لطیف وخوبصورت اسلوب کے ذریعہ فرقہ وارانہ فسادات وعداوت کی بڑی عمدہ منظرکشی کی گئی ہے۔پیش ہے ایک اقتباس:

''گرم آلودموسم نے اندھیر گردی مچائی ہے ۔تُند وتیز ہوائیں اُس میں ٹکراتی رہتی ہیں ۔ظُلم وجبر،نفرت وعداوت اوردرد والم کے کارن لوگوں میں ہاہا کار مچا ہوا ہے۔آگ کے شعلوں سے دھرتی جل رہی ہے پھر بھی اِن کی ہنٹکر نہیں ٹُوٹتی۔لوگوں کا درد اِن کی بے دردی کی وجہ سے ہے۔'' 41؎

**افسانہ''جمہوریت''** کاایک منظر پیش کرتے ہوئے خالدحسین نے پہاڑاورجنگل کی منظرکشی شگفتہ اورپُر لطف اسلوب کے ذریعے کی ہے،اقتباس ملاحظہ ہو:

''یا اللہ!میں نے کون سے گناہ کیے ہیں کہ ان پہاڑوں کی خاک چھاننی پڑ رہی ہے۔راستہ ہے کہ ختم ہونے کو ہی نہیں آتا۔۔۔۔چیڑ،دیودار،پھلائی،سبنل کمیلا اورشیشم سے بھرے جنگلوں میں پگڈنڈی بل کھاتے ناگ کی طرح ڈس رہی ہے۔انس،پلّسو اورشیر گڑھی کی ندیاں اپنے چناب سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔دورسامنے کوثر ناگ کا نیلا پانی سورج کو نہلا یا رہا ہے۔پیر پنچال نے اپنے جسم پر برف کی چادراوڑھ رکھی ہے۔سردی اتنی شدید ہے کہ کانگڑی جم جائے مگر

سہاڑھ، دیول، لدّ کی پگڈنڈیوں نے میرا خون جمنے نہیں دیا۔ میرا جسم پسینہ سے
شرابور ہے اور میں چل رہا ہوں۔''42

**افسانہ ''لکیر''** میں جب راوی کو 2005ء میں سری نگر سے مظفرآباد جانے والی پہلی بس میں پاکستان جانے کا موقعہ فراہم ہوا تو اس منظر کو انہوں نے مذکورہ افسانے میں اس طرح پیش کیا ہے:

''ہم دونوں میاں بیوی خوش تھے۔ میری بیگم نسیم کے پھوپھی زاد بھائی بہنیں
اور موسیاں میرپور، راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور اور سیالکوٹ میں رہتے
ہیں۔ جن سے ملاقات کرنے ہم نصف صدی کے بعد جا رہے تھے۔ بھارت
اور پاکستان کے نجی ٹیلی ویژن چینل ہمارے اور ہمارے رشتہ داروں کے انٹرویو
دکھا رہے تھے اور اخباریں ہمارے متعلق سرخیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یوں دن
گذرتے گئے اور پھر 5/اپریل 2005ء کا وہ دن بھی قریب آ گیا جب ہمیں
جموں سے سری نگر کے لئے روانہ ہونا تھا تا کہ 7/اپریل کو سری نگر سے مظفرآباد
جانے والی پہلی بس میں سوار ہو سکیں۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا۔''43

غرض خالد حسین نے اپنے افسانوں میں منظر نگاری سے خوب کام لیا ہے انہوں نے جتنے بھی مناظر اپنے افسانے میں پیش کیے وہ سب کے سب ان کے تجربات اور مشاہدات کی دَین ہے۔ انہوں نے جموں وکشمیر کے قدرتی مناظر یعنی پہاڑوں، جنگلوں، پیڑ پودوں، دریاؤں، جھرنوں، جھیلوں وغیرہ کے مناظر کے علاوہ کشمیر کے باغات، پھلوں، پھولوں، موسموں وغیرہ کی بھی بہترین منظر کشی کی ہے اور ان کی پیش کشی کے وقت وہ انسانی جذبات واحساسات کی بھی حسین تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔

## جذبات نگاری:

افسانہ میں جذبات نگاری کی بھی اہمیت ہوتی ہے ۔جذبات نگاری کا تعلق انسانی کرداروں سے گہرا ہوتا ہے افسانے میں واقعات کچھ المناک کچھ خوبصورت، حیرت انگیز ونشاط انگیز ہوتے ہیں اسی طرح کہانی میں کرداروں کی نفسیاتی کشمکش ودلی جذبات کا اظہار قدم قدم پر نظر آتا ہے ۔افسانہ نگار کرداروں کے جذبات پیش کرتے ہوئے افسانے میں ایک خاص تاثر پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے ۔خالد حسین نے اپنے افسانوں میں جذبات نگاری سے بھی خوب خوب کام لیا ہے ۔مثلاً افسانہ ''لکیر'' میں چودھری کی بیٹی صابری اپنے ہی گھر کے نوکر سجاول سے محبت کرتی ہے جب چودھری کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنی بیٹی کے لئے دولہا ڈھونڈنے لگتا ہے اور اس کے بعد رشتے آنے لگتے ہیں ۔صابری کو یہ سب برداشت نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے عشقیہ جذبات کا اظہار اپنی ماں کے سامنے یوں کرتی ہے ۔ایک اقتباس پیش ہے:

> ''میں سجاول کو چاہتی ہوں ۔وہ میرا رانجھا جوگی ہے اورمَیں اُس کی جوگن ۔ہماری جوڑی بہت جچتی ہے ۔میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔آپ باہر تانکنا جھانکنا بندکریں ۔جب گھر میں لڑکا ہے تو باہر ڈھونڈنے کا کیا مقصد۔ہماری شادی کرادو۔میں آپ کی اکلوتی بیٹی ہوں ۔سجاول ہمارے گھر میں ہی رہے گا اور ساری عمر آپ کی خدمت کرے گا۔اُس کا آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہے ۔وہ یہاں ہی پلا بڑھا ہے اور یہاں ہی اپنی گرہستی بنائے گا۔اماں تُو ابا کو سمجھا۔''44

اسی کہانی میں آگے جب صابری کی یہ باتیں سن کر اس کی ماں جذباتی ہوجاتی ہے تو خالد حسین نے صابری کی ماں کے جذبات کی عکاسی بڑے سلیقے سے یوں کی ہے ۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''صابری !چودھری کو قہر چڑھا ہوا ہے ۔وہ سجاول کے ٹکڑے کردے گا ۔سجاول

کے ساتھ تمہاری شادی کی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی ۔گاؤں کے نمبردار کی بیٹی کی شادی ایک نوکر کے ساتھ ۔ یہ ناممکن ہے ۔اس کے پاس ہے ہی کیا۔ وہ تمہیں کہاں سے کھلائے گا۔صابری! تنکوں سے گھونسلے تو بنتے ہیں لیکن گھر نہیں بنتے ۔تم پر سجاول نے جادو کر دیا ہے ۔اِسی لیے تم یہ بکواس کر رہی ہو۔'' 45

**افسانہ ''ستی سر کا سورج'' میں خالد حسین نے '' ستی سر'' کی تہذیب وثقافت کے زوال کا کرب پوری شدت کے ساتھ بڑے ہی جذباتی انداز میں یوں پیش کیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:**

''دھرم اور راج نیتی نے دِلوں میں نفرت کا زہر بھر دیا ۔فقیری اور درویشی دم توڑنے لگی ۔سادھ اور سنتوں کے تکیے اُجڑنے لگے۔لوگ ''اللہ ایشور تیرو نام'' کو چھوڑ کر بارود کی پوجا کرنے لگے۔ وید، گرنتھ، پُران اور سامی کتابیں دفن کر دی گئیں۔ نئے گرنتھ لکھے جانے لگے۔ جہاد اور فساد کا فلسفہ پروان چڑھنے لگا۔ گھروں، سڑکوں اور کھیتوں میں بم بیجے گئے ۔مکر اور فریب کی دُکانیں مندروں اور مسجدوں میں سجائی گئیں ۔وقت ایسا آیا کہ بھائی بھائی سے ڈرنے لگا۔ ۔شک اور نفرت نے بھائیوں میں لکیر کھینچ دی۔ سچ اور محبت کی دولت، دھرم اور سیاست کے مرتبانوں میں قید کر دی گئی۔ پھر عزت اور شرافت کی دستار مٹی میں مل گئی ۔عورتیں چوراہوں پر ننگی کی گئیں ۔ پھر لوگوں نے غنڈوں کی سرداری دیکھی۔ شریفوں کی لاچاری دیکھی۔ بچے دانیاں لہولہان ہوگئیں ۔بارود نے زندگی اور موت کے درمیان کا فاصلہ مٹا دیا۔ بدکاری اور بدچلنی عام ہوگئی ۔بے حیائی سڑکوں پر ناچنے لگی۔ لوگ گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے ۔۔۔۔۔ پاپی صرف پاپ ہوئے نہ مائی کے نہ باپ کے ہوئے ۔گھروں میں روز ماتمی چٹائیاں بچھنے لگیں ۔ بارُود کے کھیل میں مکان جلے ۔مندر، مسجد اور خانقاہیں جلیں

۔۔۔اورایک دِن اِس بارود کے کھیل میں نُند رشی کا مزار بھی جل گیا۔اُس کا آباد چرار بھی جل گیا۔۔۔۔''46؎

**افسانہ ''ایک مرے بندے کی کہانی''** میں جب پولیس، ملی ٹینٹوں کو کھانا کھلانے اور انہیں جگہ دینے کے جرم میں منظور کو بار بار پکڑ کر لے جاتی ہے تو اس کی گھریلو حالت ابتر ہو جاتی ہے آخر کار وہ تنگ آ کر ملی ٹینٹوں کے ساتھ جا ملتا ہے منظور اپنے ابّو سے کہتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''میری وجہ سے تمہاری زمین، جائداد، دولت اور عزت سب ختم ہو چکی ہے۔تم نے مجھے بچانے کے لیے خود کو بھی داؤ پر لگا دیا لیکن سب بے کار ہو گیا۔اب تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچا ہے۔اس لیے اب مجھے گھر سے جانے کی اجازت دو دو۔مَیں اُن ملی ٹینٹوں کے پاس ہی جاؤں گا جن کی وجہ سے ہماری یہ حالت ہوئی ہے۔اس لیے میرے پاس اب کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔یہاں ہمارے ماتھے پر لکھی بدنامی کوئی نہیں مٹا سکتا۔اس لیے میری غلطیاں ،گُستاخیاں اور بیوقوفیاں معاف کر دینا۔''47؎

**افسانہ ''آدمی کے اندر چھپا آدمی''** میں ضمیر احمد جو کہ ایک جذباتی کردار ہے اپنے طبقے کے ساتھ ہو رہی بے انصافیوں کے لیے حکومت اور اکثریتی طبقے کو ذمہ دار گردانتا ہے اور اس کے خلاف بولتا رہتا ہے۔خالد حسین نے ضمیر احمد کے ذریعہ جذبات نگاری کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''جناب! دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ہماری حالت شودروں سے بھی بدتر ہو گئی۔ہماری پہچان ملک

دُشمن ،غدار ،جنونی اوردہشت گرد بنادی گئی ۔ہمیں ہرمیدان میں پچھاڑ دیا گیا ہے۔ہم غُربت اورمسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں ۔ہم لاچارہوچکے ہیں۔ہماری لاچاری پربت سے سے بھی بھاری ہے۔ہمارے اندردراڑیں ہی دراڑیں ہیں۔ہمارے گھروں میں پھیلی اُداسی انہیں خوشحالی دِکھتی ہے ۔یہ ترشول،نیزے ،یہ بھالے،تلواروں اور بندوقوں سے ہماری شناخت ختم کرنا چاہتے ہیں۔شیخ سعدی نے ٹھیک ہی فرمایا ہے کہ جس کے ہاتھ میں تیغ،اُسی کے ہاتھ دیگ اور یہ لوگ ہماری ہی دیگ میں ہمارے ہی لہو سے ہمارا ہی گوشت اُبالتے ہیں اور کتوں کو کھلاتے ہیں۔ہماری تو دیش ماتا سوتیلی ہے اور باپ قصائی ۔۔۔۔۔ہم نہ سوئی کے قابل ہیں اور نہ سلائی کے۔'' 48؎

اسی کہانی میں جب ملی ٹنینٹ ڈرائیور تیج رام کو مارنے لگتے ہیں تو ضمیر احمد اپنی جان کی پرواہ نہ کیے بغیر ملی ٹینٹوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور ڈرائیور تیج رام ان کے نرغے سے چھڑانے کے لیے بڑے ہی جذباتی انداز میں بولتا ہے۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے ۔تم تیج رام کو نہیں مار سکتے ۔اس معصوم بے گناہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ۔نہتے اور کمزور کو مارنا کس مذہب میں لکھا ہے ۔ہمیں ایسی آزادی کی ضرورت نہیں جس میں دوسرے مذاہب اورعقیدوں کے ماننے والوں کو اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق نہ ہو۔ہم بھیڑیوں کے جنگل میں نہیں رہتے ۔ہم انسان ہیں اور انسانیت کے اصولوں کے مطابق زندگی جینا چاہتے ہیں۔ہم خدا سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔تم بھی اللہ سے ڈرو۔موت ہندو یا مسلماں نہیں دیکھتی۔۔۔۔۔اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ زمین پر رہنے والی مخلوق پر رحم کرو۔اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔تم بے شک مجھے گولی مارو مگر مَیں تیج رام کو مرنے

نہیں دوں گا۔''49؎

**افسانہ ''حلالہ''** میں خالد حسین نے نواب اور راجاں کے جنسی خواہشات کے ذریعے جذبات نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے:

> ''سہاگ رات کو صندلی رنگ کی راجاں صندل کی گہری خوشبو کی طرح نواب کے دِل میں اُتر گئی تھی ۔اس کے گالوں پر بہاریں مُسکرا رہی تھیں۔عنابی ہوٹوں پر مستی کی چکنائی تیر رہی تھی ۔گہری سیاہ زلفیں جب پھنکارتے ہوئے سانپ کی طرح مخملی تکیے پر بکھریں تو نواب سے رہا نہ گیا۔وہ اپنے بے قابو من کو گرم گرم سانسوں کی ٹکور دینے لگا لیکن دل میں بھڑکتے ہوئے شعلے جب آسمان چھونے لگے تو وہ جلتی ہوئی آگ کو گرم پانی سے بجھانے کے لیے راجاں کے ریشمی بدن کے ساتھ مخملی کمبل میں گھس گیا۔نواب نے تو شاید اپنی آگ کو سرد کر لیا ہو لیکن ٹھنڈے یخ پانی سے نہانے کے باوجود بھی راجاں کے جسم کی آگ نہیں بجھی تھی۔''50؎

اسی افسانے میں آگے جب نواب اپنی بیوی راجاں کو جواد کی باہوں میں موج مستی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ راجاں کو عین موقع پر تین بار طلاق دیتا ہے راجاں رونے اور گڑگڑانے لگتی ہے اور نواب سے منت سماجت کرتی ہے لیکن نواب جذباتی ہو کر راجاں کو دھکے مارنے لگتا ہے اور بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر نکالنے لگتا ہے۔راجاں بھی جذباتی ہو کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی ہے اس جذبات نگاری کی عکاسی خالد حسین نے یوں کی ہے:

> ''بس نواب بس۔۔۔تو نے بہت بکواس کر لیا۔۔۔تُو نے بہت گالیاں دے دیں۔۔۔جب تو نے میرے ساتھ سبھی رشتے ہی توڑ لیے ہیں تو پھر تمہیں کوئی حق نہیں ہے مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کا۔۔مجھے بُرا بھلا کہنے کا۔۔۔مَیں نے جو کیا وہ

بھول بھلیکے ،میرے کرم اللہ دیکھے تو یہ بتا کہ تیرے پاس کون سا گُن ہے جو تو اپنی عزت کو رو رہا ہے ۔تیرے پاس تیر ہے نہ کمان پھر تو کہاں کا پٹھان؟ارے روتو مَیں رہی ہوں اپنی قسمت کو جو تیرے جیسے بے کرتوت کے پلے باندھ دی گئی۔عزت اور شرافت تبھی قائم رہتی ہے جب کسی کے پاس سخاوت ہو۔تیرے پاس تو کوڑی بھی نہیں پھر تو کہاں کا سخی۔''51؎

افسانہ ''سانجھا دور''میں خالد حسین نے خواجہ صاحب اور گاش لعل کے ذریعے جذبات نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''خواجہ صاحب !میں نے بھی بھلا آپ کو کہاں پہچانا ہے ۔میں تو آپ کو بالکل نہیں جانتا۔آپ کو کشمیری لباس میں دیکھ کر میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور بے اختیار آپ کو گلے لگا لیا۔آپ کو گلے لگا کر مجھے ایک سکون سا ملا۔آپ سے گلے مل کر مجھے لگا کہ مَیں کشمیر کو گلے لگا رہا ہوں اور پنڈت گاش لعل کول نے خواجہ صاحب کو ایک بار پھر اپنی باہوں میں لے لیا۔۔۔اور فرطِ جذبات میں دونوں کی آنکھوں سے جہلم اُمڈ پڑا۔''52؎

خالد حسین کے افسانوں میں جذبات نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں انہوں نے خوشی ،غم ،محبت ،نفرت ،جدائی ،تنہائی اور مایوسی وغیرہ سبھی انسانی جذبات کی عکاسی بڑے سلیقے سے کی ہے۔غرض خالد حسین کو انسانی نفسیات کا بھرپور علم ہے۔وہ رشتوں کا احساس واحترام بخوبی جانتے ہیں اس لیے ان کے تمام کردار جاندار اور متحرک نظر آتے ہیں اور ان کی جذباتی کشمکش اور نفسیاتی کیفیات سے قاری کا تجسس اور بڑھ جاتا ہے اور تاثر شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ان کی جذبات نگاری کی وجہ سے ان کی تمام کہانیاں قاری کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔

## جزئیات نگاری:

منظر نگاری اور جزئیات نگاری میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ منظر نگاری کرتے وقت جب افسانہ نگار ایک ہی جگہ کی چیزوں کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور اسے پیش کر کے کہانی کو مزید دلچسپ بناتا ہے تو وہ جزئیات نگاری ہے۔ افسانہ بہت مختصر ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ افسانہ نگار قاری پر اپنی بات کا گہرا تاثر چھوڑنے کے لئے جزئیات نگاری کو بروئے کار لاتا ہے۔ خالد حسین نے اپنے افسانوں میں بعض اہم مقامات پر جزئیات نگاری سے خوب کام لیا ہے مثلاً پریم کھیلن کا چاؤ میں خالد حسین نے بادشاہ ہمایوں کے مقبرے کے ایک منظر کے ذریعہ جزئیات اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ہمایوں کے مقبرے کو دیکھ کر دل خوشی اور غمی کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مُغل کاریگری کا ایک شاندار نمونہ۔ اگر تاج محل کو غور سے دیکھو تو صاف لگتا ہے کہ اُس کا نقشہ ہمایوں کے مقبرے کے ساتھ بہت حد تک ملتا ہے۔ اس عظیم عمارت میں جہاں ایک جانب شہنشاہ ہمایوں اپنی قبر میں سویا پڑا ہے وہاں مقبرے کے چوگرد مُغل حکومت کے آخری شہزادے دفن ہیں۔ جن کو انگریزوں نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا تھا اور دہلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کے زمانے میں عراق کے صدر صدام حسین، اس کے بیٹوں اور بھائیوں کو امریکیوں نے مار ڈالا اور عراق پر قبضہ کر لیا۔ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت تاج محل کی داستان بھی ہمایوں کے مقبرے سے مِلتی جُلتی ہے۔ اپنی پیاری اور دلربا بیوی کی یادگار بنانے والا خُرّم یا شاہجہاں بھی اپنے بیٹے کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اور کئی سال قید میں گذارا کر اور اپنے سارے غم اپنے ساتھ لے کر سنگ مرمر کے اس مقبرے میں دفن ہو گیا تھا۔''53

افسانہ ''ایک مرے بندے کی کہانی'' میں خالد حسین نے منظور کے کردار کے ذریعہ جزئیات نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ مثلاً

''رات کو جب سبھی سو گئے تو میں گھر سے نکلا اور سیوج دھار کی طرف چل پڑا اور سنگلاخ پہاڑی بگڈنڈی چڑھنے لگا۔ دوسری صبح میں سیوج کے میدان میں تھا۔ سیوج کے ایک طرف بھدرواہ اور چمبہ کے قصبے ہیں اور دوسری طرف ڈُوڈُو اور بنی کے علاقے۔ توی، اُجھ اور نیرو ندیاں سیوج کے پاس باس کُنڈ سے نکلتی ہیں۔ یہاں ہر سال کیلاش یاترا آتی ہے۔ ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ ہزاروں شردھالو پوجا پاٹھ کرتے ہیں۔ سیوج جڑی بوٹیوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ گرمیوں میں گوجر، بکروال اور گدی اپنے گھوڑے، گائے بھینس اور بھیڑ بکریاں لے کر یہاں چراگاہوں میں آتے ہیں۔ ان لوگوں نے یہاں عارضی ٹھکانے بنائے ہوتے ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں۔ مَیں نے بھی ایک دن اور ایک رات ایک گدی کے ساتھ کچے کوٹھے میں گذاری۔''54

افسانہ ''بیڈے کی لنکا'' میں خالد حسین نے جزئیات نگاری کا ایک اور نمونہ پیش کیا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیڈے کی لنکا کھڑی ہے۔۔ بڑے بڑے حادثوں، بھونچال اور طوفانوں کے باوجود بھی۔ یہ کوئی راون کی لنکا نہیں، جسے کوئی اجودھیا کا رام آ کے ڈھا جائے۔ یہ تو بیڈے کی لنکا ہے۔ دو کچے کمرے، ایک پکی بیٹھک اور تھوڑا سا آنگن اس لنکا کی کل کائنات ہے۔۔ بیڈے کی لنکا میں آب وہوا سخت گرم اور سخت سرد ہی رہتی ہے۔ یہ معتدل کبھی نہیں رہی۔ یہ لنکا اس عظیم بستی میں کھڑی ہے جسے کبھی محلّہ استاد غوث محمد خاں کہتے تھے۔ پر وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اس محلّہ کی ساری شان وشوکت، غیرت اور عزت کو مٹا کر رکھ دیا اور اس محلّہ کا نام

سکڑ کر صرف اُستاد محلّہ رہ گیا۔اس لنکا کے جنوب مغرب کی جانب گاشاں
اور جاناں دھوبنوں کا کچا کا کوٹھا ہے،جن کا نام اب اللہ کے فضل سے دور دور تک
مشہور ہو چکا ہے''55؎

غرض خالد حسین کو منظر نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔

## اسلوبِ بیان:

ہر فنکار کا اسلوب مختلف ہوتا ہے اور یہ اسلوب ہی ہے جو ایک فن کار کو دوسرے فن کار سے ممتاز و ممیّز کرتا ہے۔ چوں کہ اسلوب یا Style ہی اس کا اپنا ہوتا ہے۔اسلوب کی مثال جسم کے لباس کی مانند ہے جس طرح آپ کا جسم بہت خوبصورت اور سڈول ہو لیکن اگر آپ کے کپڑے گندے اور نامناسب ہیں تو اچھی سے اچھی شخصیت بھی نکھر نہیں پائے گی۔ چنانچہ افسانے کا موضوع خواہ کتنا بھی اچھوتا اور خوبصورت ہو لیکن اگر اس سے اچھے اور مناسب ،ادبی اور معیاری اسلوب میں بیان نہ کیا گیا ہو تو اس میں تاثر کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔افسانہ نگار کی زبان میں سوز و گداز ہو،اشاریت ،ایمائیت ،اور رمزیت پر گرفت ہو،معانی اور الفاظ کے مختلف شیڈس (Shades) کی فہم ہو،اچھا انشاء پرداز ہو تو یقیناً اس کا اسلوب معیاری ہوگا۔غرض ایک اچھا اسلوب اپنے اندر سحر کی سی تاثیر اور مقناطیسی کشش رکھتا ہے اور قاری کے ذہن پر دیر پا تاثر چھوڑتا ہے نیز فن کار کو حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔

خالد حسین کو زبان و بیان و اسلوب پر مکمل دسترس حاصل ہے۔زبان و بیان کے معاملے میں ان کی کہانیاں نہایت اثر انگیز اور پر لطف ہیں۔ان کی کہانیوں کی زبان نہایت صاف ستھری ،رواں ،شائستہ ،شستہ ،شگفتہ اور بامحاورہ ہوتی ہیں۔مثلاً ستی سر کا سورج میں خالد حسین نے 'ستی سر' یعنی نندرشی کی روحانی تعلیمات اور انسان دوستی پر روشنی ڈالتے ہوئے دلفریب اسلوب اختیار کیا ہے۔ایک اقتباس دیکھئے:

''مگر وہ دنیا کی تمام قیمتی چیزوں کو چھوڑ کر محبت کا آٹا چوری کر کے لے گیا

اورطریقت کے چھاننے میں چھان کرعرفان کے تندور میں روٹیاں پکانے لگا
اورخلقت کوکھلانے لگا۔‘‘56

مذکورہ اقتباس میں محبت کا آٹا،عرفان کےتندور، وغیرہ ترکیبات اورمحاورات کوخالدحسین نے برت کرافسانہ کومعنی آفرین اور پرلطف بنادیا ہے۔

اسی افسانے میں آگے جب انّا کے شکارحکمرانوں،جنونی ملاؤں،ادھرمی دھرماتماؤں نے ہرطرح کے ہتکھنڈے استعمال کرکے'ستی سر' کی مثالی انسان دوست ثقافت کی دھجیاں اڑا دی ہیں ۔توخالدحسین نے زبان وبیان کابڑے ہی جذباتی انداز میں استعمال کیاہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’درویشی،فقیری اورصبوری کی گردن مروڑ دی گئی۔۔۔پھرلوگوں نےغنڈوں کی سرداری دیکھی،شریفوں کی لاچاری دیکھی۔۔۔آگ اوردھوئیں سے ساری دھرتی کالی ہوگئی ،خیروبرکت سوالی ہوگئی۔۔۔۔۔دستر خوانوں پر دکھوں کی روٹی،درد کے سالن کےساتھ کھائی گئی۔‘‘57

اس اقتباس میں روحانیت کے دسترخوان ،دکھوں کی روٹی ،درد کے سالن ،ترکیبات اورمحاورات ہیں۔

خالدحسین نے اپنی کہانی میں مختلف تراکیب ومحاورات اورنادراستعارات وعلامات کےلسانی برتاؤ سےادائے مطلب کی نئی راہیں ہموارکی ہیں مثلاً افسانہ’ ’ایک مرے بندے کی کہانی‘‘میں تھانیدارکی منظور کے ساتھ بدسلوکیوں کے اظہار کے لئے انہوں نے منفرد تراکیب ومحاورات اورنادر استعارات کا استعمال کیاہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

’’اُسے پاکھنڈ،گھمنڈاورموہمایا کی بیماری تھی اورکرودھ کا کینسربھی۔۔۔اندرہوسچ توباہرجاکے نچ۔دوسری صبح میں سیوج کے میدان میں تھا۔سیوج کےایک طرف

بھدرواہ اور چمنبہ کے قصبے ہیں اور دوسری طرف ڈڈواور بنی کے علاقے
توی، اُجھ اور نیر وندیاں سیوج کے پاس باس کنڈ سے نکلتی ہیں۔ یہاں ہر سال
کیلاش یاترا آتی ہے، ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ ہزاروں شردھالوں پوجا پاٹھ کرتے
ہیں۔''58؎

مذکورہ اقتباس میں پاکھنڈ، گھمنڈ اور موہ مایا کی بیماری، کرودھ کا کینسر، اندر ہو سچ تو باہر جا کے نچ ترا کیب ومحاورات ہیں۔

اسی طرح افسانہ ''بھوک کو بھوجن کیا'' میں خالد حسین نے بہترین محاورات کا استعمال کیا ہے مثلاً

''لیکن گلابو کا گاماں بھی کوئی فرشتہ نہ تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا ''باہر میاں لکھ
ہزاری، اندی بیوی قہر کی امری'' والا حساب تھا۔۔۔لاجو پہلی بار کلونتے چودھری
کے بیٹے بنتے کے ساتھ بھاگی جو اُسے امرتسر میں امرت پلانے کے بعد ساتویں
دن گھر لے آیا۔۔کریمے نے اختری بائی کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور فقیر کی جھولی
میں خدا جانے کس کس نے خیرات ڈالی تھی۔ سارا گاؤں اس حقیقت کو جانتا تھا
سیانے کہتے ہیں نا کہ ''ٹٹوا کھا گیا بٹوا پھر ٹٹوے کا ٹٹوا''59؎

مذکورہ اقتباس میں باہر میاں لکھ ہزاری، اندبیوی قہر کی ماری، ٹٹوا کھا گیا بٹوا پھر ٹٹوے کا ٹٹوا۔ محاورات ہیں۔

خالد حسین کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہوتی ہے کوئی بھی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے قاری کو کسی طرح کی الجھن ہو، زبان نہایت صاف ستھری، رواں اور سلیس ہے۔ مثلاً افسانہ ''حلالہ'' سے ایک اقتباس دیکھئے:

''نواب اس کے ساتھ میٹھا بولتا اور اس پر موتی نچھاور کرتا۔ وہ اسے ہر طرح سے
خوش رکھنے کی کوشش کرتا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ عورت پہلے ''نز'' اور بعد میں

''زر'' مانگتی ہے۔۔۔نواب سمجھتا تھا کہ ''عورت گھر کی رانی اور مرد ڈھوئے بھار''، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ''جو عورت کرزیر کرے وہی اُترے پار۔۔۔۔وہ سوچنے لگی کہ ''میاں تو مر گیا آئی کے ساتھ، بیوی کیوں مرے رضائی کے ساتھ''، شک حویلی کے اندر داخل ہو چکا تھا اور یقین ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا تھا۔''60؎

خالد حسین کے جن دیگر افسانوں میں ترکیبات، محاورات، مترادفات اور ضرب الامثال ملتے ہیں اُن میں کنوار گندل، بیڈے کی لنکا، اشتہاروں والی حویلی، پس دیوار وغیرہ شامل ہیں۔

کنوار گندل میں حسین تراکیب کا استعمال ملتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''کہتے ہیں کہ عورت کے لئے دن لوہے کا چھلا ہوتا ہے اور رات سونے کا جھومر لیکن نیفاں کے گھونسلے پر قبضہ جمانے کے بعد گلاں کے لئے دن بھی سونے کی جھانجھر تھا اور رات بھی۔''61؎

اس اقتباس میں لوہے کا چھلا اور سونے کا جھومر تراکیب ہیں۔

خالد حسین کا اسلوب شگفتہ اور لطیف ہوتا ہے۔ان کے یہاں جگہ جگہ فلسفیانہ شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔مثلاً 'افسانہ بھوک کو بھوجن کیا' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''کریمے نے اختر بائی کی کوکھ سے جنم لیا تھا اور فقیر کی جھولی میں خُدا جانے کس کس نے خیرات ڈالی تھی۔سارا گاؤں اس حقیقت کو جانتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ کریما تیس سال کا ہوتے ہوئے بھی ابھی تک کنوارہ تھا۔کریمے کی جوانی کا کیا کہنا۔دودھ کی ملائی اور کاہگانی بکروں کے پائے کھا کھا کر بھی وہ جوبن پر آنے کو ہمیشہ شرماتی رہی۔چودھری نے اُس کی صحت بنانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن سیانے کہتے ہیں نا کہ ''ٹٹوا کھا گیا بٹوا پھر ٹٹوے کا ٹٹوا''۔کریما بیچارا منہہ

چُو ہی اور پیٹ کھوئی ہی رہا۔''62؎

خالد حسین نے اپنے افسانوں میں ہندی اور پنجابی کے بہت سے الفاظ ومحاورات کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے مثلاً آدمی کے اندر چھپا آدمی کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہماری تو دیش ماتا سوتیلی ہے اور باپ قصائی، آدمی آدمی میں انتر ہوتا ہے کوئی ہیرا کوئی کنکر ہوتا ہے ۔۔۔ ہمارے خبطی مولوی بھی تو اپنے سوائے سب کو کافر سمجھتے ہیں اور لوگوں کو جہالت کی چھڑیاں مارتے رہتے ہیں ۔۔ پر یہ مولوی اپنی پھونکنی سے موت کے فتوے پھونکتے رہتے ہیں۔ یہ دھرم کی آڑ میں غدودیں بیچتے ہیں ۔۔۔ پھر بڑے بزرگ بھی تو کہتے ہیں کہ موقع وقت پہچانئے، کوئی بکے گالیاں مسکرا کر ٹالیے۔''63؎

اسی طرح افسانہ ''حرص کا سفر'' میں ہندی اور پنجابی کے الفاظ ومحاورات کا استعمال کیا گیا ہے:

''میں نے فقیر کے ساتھ بھی یاری نہیں لگائی اور نیکی جیسے لفظ کو اپنے دل سے جوتے پہ پڑی گرد کی طرح جھاڑ دیا اور من کے اندر موہ، مایا، کام، کرودھ اور اہنکا کو پالتا رہا اور اپنا کرم کانڈ کرتا رہا۔ میں ریشم کی کھپٹی کی طرح اپنے ضمیر پر مکر چکر کا جال بنتا رہا۔ کاغذی تیتر اور بٹیر میرے چوگرد طواف کرتے رہے۔ میں ان کی چونچ میں چوگ ڈالتا رہا اور انہیں موہ مایا کی گیدڑ سنگھی سنگھاتا رہا۔''64؎

خالد حسین کے یہاں جملوں میں قافیہ پیمائی بھی ملتی ہے، مثلاً آدمی کے اندر چھپا آدمی کے دو جملے دیکھئے:

''ہماری تو دیش ماتا سوتیلی ہے اور باپ قصائی، آدمی آدمی میں انتر ہوتا ہے کوئی ہیرا کوئی کنکر ہوتا ہے۔''

یا اشتہاروں والی حویلی کا ایک جملہ دیکھئے۔ جس میں صوتی تکرار کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

'ساڑھیوں کی سرسراہٹ، شلواروں کی کھڑکھڑاہٹ، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ

اور جھانجھروں کی چھنچھناہٹ۔'

غرض خالد حسین نے اپنی کہانیوں میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں بڑا تنوع ہے۔اس میں بے ساختہ مؤثر پیرائے، دھیما پن، طنز و تمسخر اور سوز و گداز سبھی کچھ شامل ہے۔ان کی زبان میں بے ساختگی اور روانی ہے۔شگفتہ اور لطیف اسلوب کے ذریعہ کرداروں کی کیفیات کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔دلچسپ اور انوکھی تشبیہات اور محاوروں کے ذریعہ اپنے انداز بیان میں جان پیدا کردی ہے۔غرض ان کے افسانوں کے مطالعے سے زبان و بیان پر ان کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

## خودکلامی کی تکنیک:

خودکلامی کی تکنیک وہ تکنیک ہوتی ہے جس میں کسی کی سوچ یا خیالات کو بطور تحریر بیان کیا جاتا ہے۔داخلی خودکلامی ایک طرح سے عملی کلام ہوتا ہے۔خودکلامی کی تکنیک تین طرح کی ہوتی ہے۔داخلی خودکلامی، سالیلوکی اور شعور کی رو۔یہ تینوں الگ الگ تکنیک ہیں۔گوپی چند رنگ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ افسانہ نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خودکلامی کی تکنیک استعمال کرے یا نہ کرے۔

خالد حسین کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے لیکن جدیدیت کے زیر اثر جس طرح علامتوں کا استعمال ہوتا ہے، انہوں نے ان پیچیدہ علامتوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔جدید عہد میں لکھنے کے باوجود انہوں نے داخلیت سے زیادہ خارجی مسائل کی طرف توجہ کی لیکن باوجود اس کے جدید افسانہ نگاروں کی طرح انہوں نے تکنیک کے بعض تجربے ضرور کیئے ہیں مثلاً ان کے افسانوں میں خودکلامی تکنیک کی چند مثالیں ملتی ہیں۔افسانہ 'گھر کی جنت' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں عثمان کو، جو کہ پہلے سے ہی شادی شدہ ہوتا ہے۔شہناز سے محبت ہوجاتی ہے۔ایک مرتبہ وہ دونوں فلم دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔شام کو جب عثمان اُسے گھر چھوڑنے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچتا ہے تو اسے اپنی بیوی کا خیال آتا ہے جو کہ خودکلامی کی اچھی مثال ہے:

''وہ کتنی محبت کرتی ہے مجھ سے ۔اُس نے میرے لیے اپنے ماں باپ ،مال وجائداد سب کو چھوڑ دیا تھا،لیکن بیٹی کی ضد کے آگے انہوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے ۔۔۔۔کیا میری بیوی کو صرف پیسوں کی ضرورت ہے ؟ کیا اُسے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔''65؎

**افسانہ ''شائنگ انڈیا''** میں مفلسی کو موضوع بناتے ہوئے افسانہ نگار نے گنگو کے کردار کے ذریعہ خودکلامی کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''پتھر کے بستر پر مفلس کو کس مزے سے نیند آتی ہے۔ایسی نیند تو شاید سوشلزم کے علمبرداروں کو ایئر کنڈیشن کمروں میں بچھے نرم بستروں پر بھی نہیں آتی ہوگی ۔۔۔کتنی ترقی کی ہے آج کی دنیا نے۔یہ بڑی بڑی فیکٹریاں،کھاد کی،کپڑوں کی ،بڑی بڑی مشینوں کی ،یہ چمنیوں سے اُٹھتا ہوا دھواں اور ان کے اندر کام کرتا ہوا افلاس۔یہ بڑے بڑے ڈیم ترقی کے ضامن۔اسلحہ ساز کارخانے۔یہ ملک کا بچاؤ سامان،ایٹم بم،اس سائنسی دور نے کتنی ترقی کی ہے لیکن سب سے زیادہ ترقی تو مفلسی میں ہوتی ہے۔آج دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ پتھر کے زمانے سے بھی ابتر حالت میں دن گذار رہا ہے۔دنیا کے بیشتر حصے پر اسی منحوس لفظ کا سایہ ہے۔''66؎

خودکلامی کی ایک اور مثال افسانہ 'روپ اور سائے' سے ملاحظہ کیجیے جس میں راوی ایک شہری بابو کے ہاتھوں راجو کی لٹی ہوئی عزت کی کہانی سننے کے بعد خود سے ہم کلام ہوتا ہے:

''انسان کے اس وحشی پن نہ جانے کتنے گھر اُجاڑ دیے ہیں۔انسان بھی کیا درندہ ہے جو اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے کیسے کیسے گُناہ کرتا ہے۔اُسے نہ مندر و مسجد سے خوف آتا ہے نہ گورودوارہ اور کلیسا سے۔موقع ملنے پر وہ بھگوان کی بھی عزت

لوٹ لیتا ہے ۔۔۔کیا اس خوبصورت لڑکی کی قیمت صرف سو روپے ہے
؟ کیا انسان کی عزت اتنے سستے داموں فروخت ہوتی ہے؟ کیا یہ حوا کی بیٹی نہیں
؟ کیا یہ سیتا کی بیٹی نہیں ؟ پھر کیوں عورت کی عصمت سے کھیلا جاتا ہے؟ کیوں
عورت کو رسوا کیا جاتا ہے؟'' 67

## فلیش بیک کی تکنیک:

خالد حسین نے اپنے افسانوں میں فلیش بیک کی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے ۔ان کے کردار اکثر اپنی ماضی کی داستاں سناتے وقت فلیش بیک میں چلے جاتے ہیں ۔اس وقت تک کہانی پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی ہے اور کرداروں کے برتاؤ کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔اس کی دو مثالیں ملاحظہ کیجئے ۔افسانہ 'لکیر' میں سجاول چودھری راوی کو اپنی ماضی کی روداد سناتے ہوئے فلیش بیک میں چلا جاتا ہے۔

''بیٹا! میں بھوٹ بھائیاں کے نمبردار چودھری سراج الدین کے گھر چاکری کرتا تھا۔۔میرا باپ بچپن میں ہی فوت ہو گیا تھا۔اور ماں نے دوسری شادی کر لی تھی ۔میرا سوتیلا باپ مجھے بات بات پر مارتا، پیٹتا اور گالیاں بکتا۔آخر تنگ آ کر میں گھر سے بھاگ نکلا ور چودھری سراج کے پاس آ گیا ۔اُس نے مجھے آسرا دیا اور اپنا نوکر رکھ لیا۔چودھری سراج کی اکلوتی بیٹی تھی ۔اس کا نام صابری تھا۔وہ مجھے چاہنے لگی تھی ۔۔۔۔ہم دونوں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ۔ہم اپنی چھوٹی سی دنیا میں خوش تھے ۔۔۔صابری اپنی ماں سے ملنے کے کچھ دنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا ۔کشت وخوں کی ایک آندھی چلی ۔ میں صابری بھوٹ بھائیاں پاکستان میں رہ گئی اور اس کا سجاول راجوری ہندوستان میں رہ گیا''۔68

**افسانہ ''روپ اور سائے''** میں ایک شہری بابو راجو کی عزت لوٹنے کے بعد شہر چلا جاتا ہے۔ راجو راوی کو اپنی ماضی کی روداد سناتے ہوئے فلیش بیک میں چلی جاتی ہے۔

''بابو جی! میں اور میرا باپو اُس پہاڑی والے مکان میں رہتے تھے۔ تھوڑی سی زمین ہے جس پر کاشت کر کے ہم اپنا پیٹ پالتے تھے۔ میرا باپو اکثر بیمار رہتا تھا۔ ایک دن وہ بہت بیمار ہوا۔ دیوالی کا ہی دن تھا اور میں بن سنور کر گاؤں کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ گھر پہنچی تو دیکھا، باپو کو کھانسی کے ساتھ خون آ رہا تھا۔ مَیں گھبرائی ہوئی باہر کر دوڑی۔ میرے پاس پیسے نہ تھے۔ پھر بھی میرے قدم وید جی کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ایک شہری بابو مجھے ملا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کیمرا تھا۔ میری گھبراہٹ کو دیکھ کر وہ بولا:

کیا بات ہے؟

مَیں نے باپو کی بیماری کا سارا قِصہ سُنایا۔ وہ بولا:

''گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے مجھے کہا کہ اگر میں اسے اپنے دو فوٹو کھینچنے دوں تو وہ مجھے سو روپے دے گا۔ میں مان گئی۔ اس نے مجھے سو کا نوٹ دیا اور میرے تین چار فوٹو اُتارے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دوڑ جانا ہی چاہتی تھی کہ اس نے میری کلائی پکڑی اور بولا ''ابھی کیسے جا سکتی ہو، ابھی پوری قیمت تو چُکاتی جاؤ۔'' میں ڈر گئی۔ اسنے میری کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔ میں نے کلائی چھڑانے کی لاکھ کوشش کی لیکن بے سود۔ میں چلّائی۔ بچاؤ، بچاؤ، لیکن اس جنگل بیابان میں میری آواز درختوں سے ٹکرا کر ختم ہو گئی۔ اس ذلیل کتے نے اپنی ہوس پوری کی۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے

ہوش آیا تو خوب روئی۔گھر پہنچی تو میرا باپو مر چُکا تھا۔۔۔''69؎

غرض خالد حسین نے اپنے افسانوں میں اسلوب اور تکنیک کے تجربے کرنے کی کامیاب کوشش کی ہیں۔خالد حسین کی کہانیوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں فن افسانہ نگاری کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ان کے افسانوں میں ہمیں جموں وکشمیر کا ماحول،تہذیب وثقافت،رسم ورواج اور یہاں کے پُر آشوب حالات،واقعات کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔انہوں نے سیاسی ،سماجی ومعاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کے موضوعات بنائے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں بڑے جاندار اور فعال کردار پیش کیے ہیں جن میں زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔مکالمہ نگاری پر بھی انہیں قدرت حاصل ہے۔خالد حسین نے اپنے مکالموں میں عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے جو سادہ سلیس بھی ہے اور عام فہم بھی۔ہر کردار اپنے مقام اور مرتبے کے مطابق مکالمے ادا کرتا ہے۔جذبات نگاری میں بھی خالد حسین کو مکمل عبور حاصل ہے۔اپنے کرداروں کی ذہنی وجذباتی کیفیات کی ترجمانی کے لئے جذبات نگاری سے کام لیا ہے۔منظر نگاری وفطرت نگاری پر بھی انہیں کمال حاصل ہے۔بڑے خوبصورت اور دل نشین مناظر پیش کر کے اپنے افسانوں کو موثر اور دلچسپ بنایا ہے۔زبان وبیان پر بھی انہیں مکمل دسترس حاصل ہے۔زبان وبیان کے معاملے میں ان کی کہانیاں نہایت اثر انگیز اور پر لطف ہیں۔خالد حسین کی کہانیوں کی زبان نہایت صاف ستھری،رواں،شائستہ،شستہ،شگفتہ اور بامحاورہ ہے۔انہوں نے پنجابی اور ہندی کے بہت سے الفاظ ومحاورات کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔خود کلامی اور فلیش بیک کی تکنیک کے تجربے بھی ان کے یہاں ملتے ہیں۔غرض ان کی افسانہ نگاری کی ان تمام خصوصیات کے پیش نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں خالد حسین کا نام ومقام خاص اور منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

☆☆☆☆

# حوالہ جات


1۔خالد حسین۔ستی سرکا سورج۔پنجاب ادبی سنگت 2011،ص52-51

2۔خالد حسین۔ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں، 1981،ص7-6

3۔خالد حسین۔ستی سرکا سورج۔پنجاب ادبی سنگت 2011،ص59-58

4۔ایضاً، 2011،ص54

5۔ایضاً،،جموں،ص84

6۔ایضاً،، 2011،ص98

7۔فن افسانہ نگاری،ص148

8۔خالد حسین،ستی سرکا سورج پنجاب ادبی سنگت جموں۔ص10-9

9۔ایضاً،ص54

10۔ایضاً،ص56-55

11۔ایضاً،ص66

12۔ایضاً،ص

13۔ایضاً،ص82-81

14۔ایضاً،ص84

15۔ایضاً،ص85

16۔ایضاً،ص95

17۔ایضاً،ص96

18۔ایضاً،ص98

19۔ایضاً،ص106

20۔ایضاً،ص105

21۔ایضاً،ص112

22۔ایضاً،ص112

23۔ایضاً،ص114

24۔ایضاً،ص112-111

25۔سنبل نگار۔اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،2005ء۔ص82

26۔خالد حسین،ستی سر کا سورج۔پنجاب ادبی سنگت ,جموں ، 2011۔ ص118

27۔ایضاً،ص120-119

28۔ایضاً،ص134-133

29۔ایضاً،ص160

30۔ایضاً،ص153-152

31۔ایضاً،ص83

32۔ایضاً،ص89

33۔ایضاً،ص94

34۔ایضاً،ص59

35۔ایضاً،ص62-61

36۔ایضاً،ص156

37۔ایضاً،ص145

38۔ایضاً،ص51

39۔ایضاً،ص56

40۔ایضاً،ص63

41۔ایضاً،ص109

42۔ایضاً،ص163

43۔ایضاً،ص65

44۔خالد حسین، ستی سر کا سورج، پنجاب ادبی سنگت، جموں۔2011،ص70

45۔ایضاً،ص70

46۔ایضاً،ص27-28

47۔ایضاً،ص94

48۔ایضاً،ص98

49۔ایضاً،ص105-106-107

50۔ایضاً،ص115-116

51۔ایضاً،ص120

52۔ایضاً،ص134-135

53۔ایضاً،ص83

54۔ایضاً،ص94

55۔ایضاً،ص51

56۔ایضاً،ص54

57۔ایضاً،ص57-60

58۔ایضاً،ص93-94

59۔ایضاً،ص111-12-13

60۔ایضاً،ص

61۔ایضاً،ص

62۔ایضاً،ص 112-13

63۔ایضاً،ص98-99

64۔ایضاً،ص155

65۔ایضاً،ص161

66۔ایضاً،ص170-171

67۔ایضاً،ص176-78

68۔ایضاً،ص179-180

69۔ایضا،ص،

# باب چہارم

# مجموعی جائزہ

خالد حسین ایک ایسا نام ہے جو اب علاقائی، قومی، مذہبی، ملکی اور لسانی حدوں اور قیدوں سے آزاد ہو کر ملکی اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ یوں تو یہ نام شروع میں بطور سرکاری آفیسر عوام الناس میں مشہور ہوا لیکن کچھ ہی عرصے میں ریاست کے ادبی حلقوں میں بھی ایک الگ پہچان بن کر اُبھرا۔ ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں خالد حسین کا نام ومقام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اگر چہ وہ بنیادی طور پر پنجابی کے افسانہ نگار ہیں لیکن اردو زبان وادب کے دلدادہ ہونے کے سبب ایک اچھے کہانی کار کی حیثیت سے اُردو کے ادبی حلقوں میں بھی اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرنے میں ہر اعتبار سے کامیاب ہوئے ہیں۔ خالد حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1969ء میں جموں کے ایک سرکاری اخبار ''دیہات سُدھار'' سے کیا۔ جس میں اُن کی ایک کہانی ''گھر کی جنت'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ادبی حلقوں میں اس کہانی کی کافی پذیرائی ہوئی اس کے بعد ان کی افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا اور ایک کے بعد دیگرے کئی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ اب تک ان کی پنجابی کہانیوں کے جو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اُن کے نام یوں ہیں۔ جہلم وگدا دیہا، (1976)، گوری فصل دے سوداگر (1981)، ڈونگے پانیاں دا دُکھ (1988)، اور ''بلدی برف داسیک (2006)''۔ اسی طرح اُردو میں اُن کے تین (۳) افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن کے نام اس طرح ہیں ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں (1981)، اشتہاروں والی حویلی (1991)، اور ستی سرکا سورج (2011)۔

خالد حسین کے تمام افسانوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کہانیوں کے تین امتیازی پہلو ایسے ہیں جو انہیں دوسرے کہانی کاروں سے انفرادی حیثیت عطا کرتے ہیں۔ پہلا امتیازی پہلو یہ کہ وہ تخیل سے گریز کرتے ہوئے اپنے گردوپیش کے ماحول ومعاشرے میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کو ایک چشم دید گواہ کے طور پر بیان کرتے ہیں بہ الفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خالد کی کہانیوں میں ہمیں جموں وکشمیر کا ماحول، تہذیب وثقافت، رسم ورواج اور یہاں کے پُر آشوب حالات

وواقعات کا پورا منظر دکھائی دیتا ہے۔دوسرا اختصار وجامعیت اورطنز ورمز کی گہری کاٹ ان کی کہانیوں کا طرہ امتیاز ہے۔تیسرا اہم امتیازی پہلو یہ کہ زبان وبیان کے معاملے میں خالد حسین کی کہانیاں نہایت اثر انگیز اور پُر لطف کہی جاسکتی ہیں کیوں کہ تشبیہات واستعارات ،محاورات ،ضرب الامثال ،رمز وکنائے ،مترادفات ،کئی جملوں میں قافیہ پیمائی اور کہیں کہیں ٹھیٹھ پنجابی الفاظ کو جس ذہنی سوجھ بوجھ کے ساتھ خالد حسین نے اپنی کہانیوں میں برتا ہے وہ اہم بات ہے۔

خالد حسین کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں ان کے افسانوں میں حقیقت اوررومان کا امتزاج ملتا ہے وہیں ان میں نفسیاتی وجنسی پیچیدگی ،مذہبی وسیاسی عوامل کی کارفرمائی اورمعاشرتی مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

خالد حسین ،منٹو،کرشن چندر، بیدی، پریم چند،قرۃ العین حیدر،علی عباس حسینی وغیرہ جیسے عظیم ومعروف افسانہ نگاروں سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ان کے افسانوں میں کرشن چندر کی رومانیت ،منٹو کی طرح تہہ درتہہ جنسی بے راہ روی اور گھٹن ، پریم اورعلی عباس حسینی کی طرح مخصوص معاشرے کے دل پذیر مرقعے اورقرۃ العین حیدر کی طرح تقسیم کے المیہ کی عکاسی پائی جاتی ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی ان کا اپنا منفرد مخصوص لب ولہجہ،زبان،انداز اوراسلوب ہے۔

خالد حسین کے موضوعات میں تنوع ہے،انہوں نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات کو پیش کیا ہے وہ عصر حاضر کے بعض اہم مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ان افسانوں میں زیادہ تر ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر تعینات فوجیوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کا قتل ،انسان کی عیاری ومکاری،خودغرضی اورمرد وزن کے بے جوڑ رشتوں کے باعث جنسی بے راہ روی یا جنسی الجھنوں کا فنکارانہ بیان موجود ہے۔ان تمام موضوعات کی علاوہ کشمیر میں پھیلی دہشت گردی،علاحدگی پسند گروپ اورفوجی مظاہم کو بھی انہوں نے اپنی کہانیوں میں جگہ دی ہے۔وہ اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کھردری سطح اورگردوپیش کے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔خالد حسین کی کہانیاں عصر حاضر کے اقتصادی،سماجی اورسیاسی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں لیکن ان کی

اکثر کہانیوں کی موضوع ذات کا کرب ہے۔

ڈاکٹر حامد کاشمیری ان کے افسانوں کے موضوعات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خالد حسین کے افسانوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے افسانے روایتی موضوعی پیش کش اور میکانکی ہیئتی برتاؤ سے انحراف کی ایک اچھی مثال فراہم کرتے ہیں۔یعنی افسانہ نگار من مانے طریقے سے کسی موضوع کو کہانی کا موضوع نہیں بناتا، نہ ہی وہ فن افسانہ کے مسلمہ اصولوں اور ضابطوں کی پابندی کو اپنے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔خالد حسین اپنے موضوعات کا شعوری انتخاب ضرور کرتے ہیں۔وہ گردوپیش کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی کے تضادات اور کھردرے پن کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی سے افسانہ لکھنے کی تحریک پاتے ہیں۔''1

خالد حسین کی افسانہ نگاری کا آغاز جدیدیت کے عہد میں ہوا۔عموماً جدید دور کے افسانوں میں پلاٹ نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو وہ غیر منظّم پلاٹ دکھائی دیتا ہے۔لیکن خالد حسین کے افسانوں میں پلاٹ ملتے ہیں۔ان کے پلاٹ سیدھے سادے اور منظّم ہوتے ہیں۔واقعات کی ترتیب میں کہیں بھی جھول پیدا نہیں ہوتا۔واقعات کو بڑے سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے۔کہانی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور یہی ان کی پلاٹ کی خوبی ہے۔

کردار نگاری کے اعتبار سے بھی خالد حسین کے افسانوں میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں نسوانی کردار بھی پیش کیے ہیں اور مرد کردار بھی۔انہوں نے عورت کی عظمت اور کردار کی بڑائی کو پیش کیا ہے۔ان کے یہاں عورت مختلف رنگوں اور مختلف کرداروں کے روپ میں نظر آتی ہے۔وہ اگر ایک مقام پر مظلوم ہے تو دوسری جگہ انتقام لینا بھی جانتی ہے۔خالد حسین کے یہاں مرد کردار بھی بڑے جاندار اور متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ان میں زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔خالد حسین اپنے افسانوی کردار

گھڑتے نہیں بلکہ اپنے سامنے اور آس پاس کی زندگی اور زمین سے منتخب کرتے ہیں۔غرض خالد حسین کے افسانوں میں جتنے بھی کردار ہیں سب اپنی جگہ اہم اور سرگرم ہیں۔

خالد حسین کی کردار نگاری کی انفرادیت کے بارے میں ڈاکٹر زینت اللہ جاویدؔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خالد حسین کے کردار یقیناً کہانی کے گذشتہ کرداروں سے مختلف ہیں۔ان کرداروں کی جرأت،ان کی صلاحیت اور ان کی محبت اور نفرت،ان کا اعتماد،ان کا زمانہ،ان کا ماحول انہیں ماضی کے کرداروں سے الگ کر دیتا ہے اور وہ اپنی ایک نئی شناخت لے کر کہانی کے منظر نامہ میں ابھر آتے ہیں۔ان کے کردار مثالی نہیں بلکہ ہماری جیتی جاگتی زندگی میں سانس لیتے ہوئے زمینی کردار ہیں جن کی نیتوں سے افسانہ نگار بخوبی واقف ہے۔خالد حسین کے کردار اپنے ہاتھوں کی لکیریں لے کر خود پیدا ہوتے ہیں افسانہ نگار محض ان کا تعارف کراتا ہے۔یہاں تک کہ وہ اپنی قوت اور نمو کے مظاہرے کے لئے بھی اپنے کرداروں کا سہارا نہیں لیتا بلکہ فطرت کے جلالی عنصر کے پس پردہ اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتا ہے۔شاید اس لیے بھی خالد کو مثالی کردار پیش کرنے کے بجائے حقیقت پسندی زیادہ عزیز ہے۔یہی وجہ ہے کہ قاری ان کرداروں میں اپنے دل کی دھڑکنیں اور اپنی زندگی کی جھلک دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔وابستگی کا یہی احساس اور قربت کی یہی آنچ خالد کی کہانیوں کا بنیادی وصف ہے۔''2؎

خالد حسین کو جذبات نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں جذبات نگاری سے خوب خوب کام لیا ہے۔انسانی جذبات کی مختلف کیفیات کو پیش کرنے میں وہ بڑے حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔خالد حسین کو انسانی جذبات کے علاوہ انسانی نفسیات پر بھی بھرپور قدرت حاصل ہیں یہی وجہ ہے

کہ وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی نفسیات کو بھی بہترین طریقے سے پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

خالد حسین نے منظر نگاری میں بھی کمال دکھایا ہے۔انہیں قدرتی ماحول اور مناظر سے بے حد لگاؤ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں جموں وکشمیر کے خوبصورت جنگلوں، جھرنوں، جھیلوں، پہاڑوں کے علاوہ وادی کشمیر کے خوبصورت باغات، پھلوں، پھولوں، موسموں وغیرہ کی بہترین منظر نگاری ملتی ہیں۔

خالد حسین کو زبان وبیان پر بھی پورا عبور حاصل ہے۔ان کی کہانیوں کی زبان نہایت صاف ستھری، رواں، شائستہ، شستہ، شگفتہ اور بامحاورہ ہوتی ہے۔انہوں نے ہندی اور پنجابی کے بہت سے الفاظ ومحاورات کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ غیر مانوس معلوم نہیں ہوتے۔رمز نگاری کا پیرائیہ بیان انہیں بے حد پسند ہے۔علاوہ ازیں استعاراتی طرزِ بیان کے باعث وہ کہانی کے ناقدین سے اپنی منفرد حیثیت منوالیتے ہیں۔ان کے کچھ افسانے زباں وبیاں اور طنز ورمز کے اچھوتے پن کی وجہ سے سعادت حسن منٹو کی یاد دلاتے ہیں۔

خالد حسین کے افسانوں کے اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر زینت اللہ جاوید لکھتی ہیں:

> ''خالد حسین کی کہانیوں میں افسانویت، ان کے اسلوب کی رہین منت ہے۔رمز نگاری کا پیرائیہ بیان انہیں مرغوب ہے اور وہ استعاراتی طرز بیان اختیار کر کے قارئین اور ناقدین سے اپنی علیحدہ حیثیت منوالیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فقروں کے چٹخارے اور معنویت کی لذت قاری کو منٹو کی یاد دلاتی ہے۔''3

اسی طرح پروفیسر اسد اللہ وانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''خالد کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت ان کا صاف اور شستہ اندازِ بیان ہے۔انہوں نے زندگی کے مسائل کا بہت قریبی اور گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور ان مسائل میں سے جس کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے اسے اسلوب میں اس طرح نبھایا ہے کہ وہ فن کا ایک عمدہ نمونہ بن گیا ہے۔''4

خالد حسین نے اپنے افسانوں میں مکالمہ نگاری سے خوب خوب کام لیا ہے۔انہوں نے ایسے مکالمے پیش کیے ہیں جو انسانی جذبات،احساسات،اور کیفیات کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں۔انہوں نے مکالموں کو موقع ومحل کی مناسبت سے برتا ہے۔ان مکالموں سے جہاں کرداروں کے جذبات واحساسات اور ان کی داخلی زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے وہیں کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کا سبب بھی ہے۔ان کے بعض مکالمے انتہائی دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ان میں موزونیت ہے۔ہر کردار اپنے مقام ومرتبہ کے مطابق مکالمے ادا کرتا ہے۔خالد حسین کے مکالمے چست،سلیس اور رواں ہیں۔

خالد حسین نے جزئیاتنگاری سے بھی کام لیا ہے انہیں منظر نگاری کے علاوہ جزئیات نگاری میں بھی کمال حاصل ہے۔

غرض خالد حسین نے اپنے افسانوں میں افسانے کے اجزائے ترکیبی کا خاص خیال رکھا ہے۔موضوعات،پلاٹ،کردار نگاری،جذبات نگاری،مکالمہ نگاری،منظر نگاری،کلائمکس اور اسلوب بیان کا لطف،اختتام سبھی ان کے افسانوں میں بدرجہ اَتم موجود ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> ''اردو میں خالد حسین واحد افسانہ نگار ہیں جو تواتر کے ساتھ اپنی زمین،اپنے ستی سر سے جڑی سیاسی،سماجی اور ثقافتی سچائیوں کو منفرد زبان،موزوں بیانیہ،جیتے جاگتے کردار اور موضوعاتی،فنی اور جمالیاتی سروکاروں کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کر رہے ہیں۔خالد حسین کے افسانوں کے بیانیہ میں حکمت ہے اور اسلوب میں جادو۔''5؎

خالد حسین کے افسانوں کی مذکورہ بالا خصوصیات اور دانشوروں کے خیالات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد حسین ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔وہ ادب کو ایک ادیب کی طرح پرکھنے کے قائل ہیں۔انہوں نے ایک ایمان دار ادیب کی طرح سماج کے مسائل کی بھرپور عکاسی کی ہے۔انسانی جذبات وکیفیات کی مکمل

عکاسی کی ہے ۔انہوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے انسانی جذبات وکیفیات کی عمدہ تصویریں پیش کی ہیں۔اسلوب نگاری میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقراررکھی ہے ۔غرض ان کے افسانوں کی جملہ خصوصیات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے افسانے اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں اوران کا نام ومقام عہد حاضر کے افسانہ نگاروں میں خاص اورمنفرد حیثیت کا حامل ہے۔

☆☆☆☆

# حوالے

1۔خالد حسین، ٹھنڈی کا نگڑی کا دھواں، 1981، ص 7-6

2۔خالد حسین، اشتہاروں والی حویلی، ذاکر پبلیکیشنز، 1991، ص 20-19

3۔خالد حسین، ستی سر کا سورج، پنجاب ادبی سنگت جموں 2011، ص 46

4۔خالد حسین، اشتہاروں والی حویلی، ذاکر پبلیکیشنز، ص 30-29

5۔خالد حسین، ستی سر کا سورج، پنجاب ادبی سنگت جموں، ص 34

# کتابیات

# کتابیات

## خالد حسین کی تصانیف

| نمبر شمار | مصنف | تصنیف | سن اشاعت | مقام اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| 1 | خالد حسین | اشتہاروں والی حویلی | 1991ء | امروز کتب، عصمت منزل، مالیر کوٹلہ، جموں |
| 2 | خالد حسین | ستی سر کا سورج | 2011ء | پنجاب ادبی سنگت، جموں |

## دیگر تصانیف

| نمبر شمار | مصنف | تصنیف | سن اشاعت | مقام اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| 1 | آل احمد سرور | ادب و نظریہ | 1954ء | لکھنؤ |
| 2 | اطہر پرویز | ادب کا مطالعہ | 1986ء | اردو گھر، علی گڑھ |
| 3 | اطہر پرویز | اردو کے تیرہ افسانے | 2008ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |
| 4 | جان محمد آزاد | جموں و کشمیر کے اردو مصنفین | 2004ء | میکاف پرنٹرس، دہلی |
| 5 | جوہر قدوسی | گلدستہ اردو | 2010ء | تکبیر پبلیکیشنز، سری نگر |
| 6 | رام بابو سکسینہ | تاریخ ادب اردو | 2003ء | غضنفر اکیدمی، پاکستان |
| 7 | سنبل نگار | اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ | 2009ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |
| 8 | سنبل نگار | فن افسانہ نگاری | 1997ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |
| 9 | شائستہ نوشین | تفہیم ادب | 2008ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |
| 10 | فخر الاسلام اعظمی | شعور فن | 2004ء | شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ |
| 11 | قمر رئیس | پریم چند کے نمائندہ افسانے | 2007ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 12 | گوپی چند نارنگ | اردو افسانے روایت اور مسائل | 1981ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی |
| 13 | گیان چند جین | تحقیق کا فن | 1990ء | اتر پردیش اردو اکیدمی، لکھنؤ |
| 14 | نورالحسن نقوی | تاریخ ادب اردو | 2010ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |
| 15 | نور شاہ | جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار | 2011ء | میزان پبلیشرز، سری نگر |
| 16 | وقار عظیم | فن افسانہ نگاری | 1949ء | ادارہ اشاعت اردو، کراچی |
| 17 | وقار عظیم | نیا افسانہ | 2009ء | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ |

# رسائل و جرائد


| | |
|---|---|
| 1 | ایوان اردو، 2008ء۔ اردو اکیدمی، دہلی |
| 2 | اردو دنیا، فروری 2011ء، دہلی |
| 3 | ادیب (سہ ماہی)، 1992ء، علی گڑھ |
| 4 | بازیافت۔ 2006ء، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی |
| 5 | تسلسل، جون، 2005، 12-11-10، شعبہ اردو جموں یونیورسٹی |
| 6 | شاعر۔ نومبر 1999ء، ممبئی |
| 7 | شبِ خون، جون 2006ء، الہ آباد |
| 8 | علی گڑھ میگزین، 1982ء، علی گڑھ |
| 9 | کتاب نما، اگست 1998، دہلی |
| 10 | لمحے لمحے (سہ ماہی)، 2013ء، بدایوں |